ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

عذر ہر ایک کو پیش آتے ہیں ، مگر
زندہ انسان وہ ہے جو عذر کو استعمال نہ کرے

نومبر ۱۹۸۷
شمارہ ۱۳۲

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمت قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۲ نومبر ۱۹۸۷

فہرست

غلاف کعبہ	صفحہ	۲	آزمودہ حل	صفحہ	۱۳
ناکامی میں کامیابی		۳	ایک سفر		۲۵
ایک ہی سبب		۴	پریس کانفرنس سے خطاب		۴۲
احتجاج یا احتساب		۷	خبرنامہ اسلامی مرکز		۴۵
ملت کی کہانی		۱۰	ایجنسی الرسالہ		۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

غلافِ کعبہ

کعبہ کے اوپر غلاف ڈالنے کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا، اس کے متعلق تاریخ کا بیان یہ ہے:

كان من الطبيعي ان لا يشارك الرسول عليه الصلاة والسلام ومعه المسلمون في كساء الكعبة قبل الفتح۔ ذالك ان المشركين من قريش لم يتيحوا لهم هذا الامر الى ان تم فتح مكة فابقى عليه الصلاة والسلام على كسوة الكعبة ولم يستبدلها حتى احترقت على يد امراة كانت تريد تبخيرها فكساها الرسول صلى الله عليه وسلم بالثياب اليمانية۔ ثم كساها الخلفاء الراشدون من بعده بالقباطى

الفیصل (ریاض) ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق اگست ۱۹۸۷، صفحہ ۶۱

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے مسلمان فتح مکہ سے پہلے کعبہ کی غلاف پوشی نہ کر سکے۔ کیونکہ قریش کے مشرکین نے انھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ تاہم فتح مکہ کے بعد بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے سابقہ غلاف کو باقی رکھا اور اس کو تبدیل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایسا ہوا کہ کعبہ کے غلاف میں ایک عورت کے ہاتھ سے آگ لگ گئی اور وہ جل گیا۔ یہ عورت اس کو خوشبو پہنچانے کے لیے دھونی دے رہی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمنی کپڑوں کا ایک غلاف کعبہ کے اوپر اوڑھایا۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین قبطی کپڑے کا غلاف کعبہ کے اوپر ڈالتے رہے۔

فتح مکہ کے وقت کعبہ کے اوپر جو غلاف تھا وہ دشمنوں اور کافروں کا بنایا ہوا تھا۔ یہ مقدس قبلہ پر غیر مقدس قبضہ کی یادگار تھا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اس کو "ناپاک" قرار دے کر فوراً اس کو بدلنے کا حکم دیدیں۔ آپ نے سابقہ غلاف کو باقی رکھا اور اس کو صرف اس وقت بدلا جب کہ جل جانے کی وجہ سے اس کا بدلنا ایک ضرورت بن گیا۔

اصلاح کا مسنون اسلامی طریقہ یہ ہے کہ ڈھانچہ کو غیر ضروری طور پر توڑے بغیر فطری انداز میں اصلاحات کا نفاذ کیا جائے۔

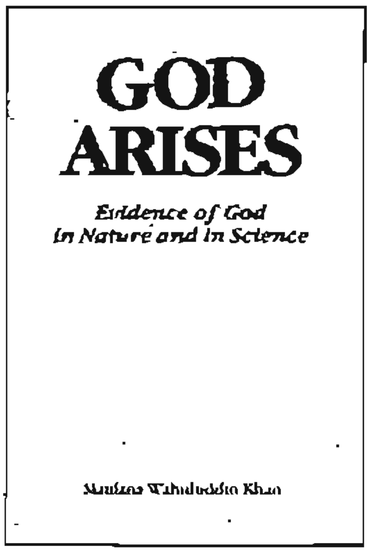
ناکامی میں کامیابی

ڈاکٹر سلیم علی (۱۹۸۷-۱۸۹۶) کو علم طیور (Ornithology) میں غیر معمولی مقام ملا۔ ہندستان نے ان کو پدما بھوشن کا خطاب دیا۔ برطانیہ نے ان کو گولڈ میڈل سے نوازا۔ ہالینڈ نے ان کو گولڈن آرک عطا کیا۔ عالمی ادارہ وائلڈ لائف نے ان کو انعام کے طور پر ۵۰ ہزار ڈالر دیئے۔ ہندستان کی تین یونیورسٹیوں نے اعزازی طور پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنائے گئے وغیرہ۔ ڈاکٹر سلیم علی کو یہ غیر معمولی کامیابی ایک غیر معمولی ناکامی کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ وہ بمبئی کے ایک گنجان علاقہ کھیت واڑی میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں روزگار کی ضرورت ہوئی۔ مگر جب وہ روزگار کی تلاش میں نکلے تو ان کے الفاظ میں " ہر ادارے اور ہر دفتر میں ان کے لیے جگہ نہیں (No vacancy) کا بورڈ لگا ہوا تھا" اس ناکامی نے ان کے لیے نئی کامیابی کے راستے کھول دیے۔

ایک روز انھوں نے ایک چھوٹی چڑیا پکڑی۔ اس کو دیکھا تو اس میں ایک غیر معمولی خصوصیت نظر آئی۔ اس کی گردن پیلے رنگ کی تھی۔ انھوں نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔ انھوں نے علم طیور کے موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک دستی دوربین حاصل کی۔ اب ان کا کام یہ ہوگیا کہ اِدھر اُدھر جاکر چڑیوں کا مشاہدہ کریں اور ان کے حالات اپنی ڈائری میں لکھیں۔ آخر کار انھوں نے علم طیور میں اتنی مہارت پیدا کی کہ خود اس فن کو نئی جہتوں اور نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک کتاب میں انھوں نے برصغیر ہند کی ۱۲۰۰ چڑیوں کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب طیور ہند (Indian Birds) ہے جو گیارہ بار چھپ چکی ہے۔ اور عالمی سطح پر پڑھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم علی کو زمینی ادارہ میں جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے آسمانی مشاہدہ میں اپنے لیے زیادہ بہتر کام تلاش کر لیا۔ ان کو ملکی ملازمت میں نہیں لیا گیا تھا، مگر اپنی اعلیٰ کارکردگی کے ذریعہ وہ عالمی اعزاز کے مستحق قرار پائے۔

جائے۔ اسی طرح انسانوں کے درمیان ان کے غیظ و غضب سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کی انا کو نہ چھیڑا جائے۔ انا کو چھیڑنے کے بعد ہمیں لازماً فریق ثانی کی غضب ناکی کا شکار ہونا پڑے گا، خواہ یہ فریق ثانی ہندو ہو یا مسلمان۔ خواہ وہ غیر قوم کا ہو یا خود اپنی قوم کا۔ کسی نے نہایت صحیح کہا ہے کہ ——— ہر آدمی کے اندر ایک شیطان سویا ہوا ہے، اس شیطان کو سویا رہنے دو۔ کیوں کہ اگر تم اس کو جگاؤ گے تو وہ سب سے پہلے تم کو اپنی خونخواری کا نشانہ بنائے گا۔



God Arises
by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 Price Rs. 45
81-85063-17-6

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

احتجاج یا احتساب

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے لے کر اب تک کی پوری تاریخ میں ہندستانی مسلمانوں نے جس مسئلہ پر سب سے زیادہ دھوم مچائی ہے وہ شاہ بانو بیگم کا مشہور معاملہ ہے۔ محمد احمد خاں۔ شاہ بانو بیگم کیس (Criminal Apeal No. 103 of 1981) پر ہندستان کی سپریم کورٹ نے ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ کو فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ میں سپریم کورٹ نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو باقی رکھا کہ محمد احمد خاں اپنی مطلقہ بیوی شاہ بانو بیگم کو 179.20 روپیہ ماہانہ بطور گزارہ (Maintenance) ادا کریں۔

یہ فیصلہ جو (Criminal P.C. (2 of 1974) S. 125-Maintenance) کے تحت دیا گیا تھا، اس میں فاضل جج نے قرآن کی آیت کا بھی حوالہ دیا اور یہ کہا کہ مطلقہ عورت کو گزارہ دینا عین قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں قرآن سے سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۱ نقل کی۔ سپریم کورٹ نے اپنے انگریزی فیصلہ میں اصلاً قرآن کے جس انگریزی ترجمہ پر انحصار کیا وہ عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ تھا۔ انھوں نے مذکورہ آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> For divorced women maintenance (should be provided) on a reasonable (scale). This is a duty on the righteous.

قرآن کی مذکورہ آیت میں "متاع" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے Maintenance کے لفظ سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو لفظ بالکل الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ ایک متاع، دوسرے نفقہ۔ متاع کا مساوی لفظ انگریزی زبان میں Provision ہے۔ اور نفقہ کا مساوی لفظ Maintenance ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ اس میں (Provision) کا لفظ استعمال کیا جائے جو وقتی عطیہ کے ہم معنی ہے۔ مگر عبداللہ یوسف علی نے غلط طور پر اس کے ترجمہ میں Maintenance کا لفظ استعمال کیا جو مستقل گزارہ کا مفہوم رکھتا ہے۔

سپریم کورٹ نے عبداللہ یوسف علی کے اس ترجمہ سے فائدہ اٹھایا اور مطلقہ کو ماہانہ گزارہ

دینے کی ہدایت جاری کردی، جب کہ آیت کے اصل الفاظ کے مطابق مطلقہ کے لیے صرف بوقت رخصت کچھ نقدیا سامان دینے کی گنجائش نکلتی تھی۔

قرآن کے اعتبار سے مذکورہ فیصلہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ صرف سپریم کورٹ کے فیصلہ پر لگا دی نہ کہ مسلمان مترجم کے انگریزی ترجمہ پر۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے خلاف تو اتنا طوفان اٹھایا کہ زمین و آسمان ایک کردیا۔ مگر مسلمانوں کی کسی بھی جماعت یا کسی بھی قابل ذکر مسلم لیڈر کے اندر یہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی کہ انگریزی کا ایک صحیح اور مستند ترجمۂ قرآن وجود میں لایا جائے تاکہ آئندہ کسی "دشمنِ اسلام" کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ ہمارے اپنے ترجمہ کا حوالہ دے کر ہمارے خلاف شرانگیزی کرسکے۔

واٹر ٹینک کا پانی بہہ کر چھت سے نیچے آرہا ہو تو زمین کی قوت کشش کے خلاف شوروغل کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ واٹر ٹینک کا سوراخ بند کیا جائے۔ اسی طرح آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی شخص آپ پر وار کرے تو دوسرے شخص کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی کمزوری کو دور کرنے میں لگ جائیے، اس کے بعد آپ خود بخود دوسروں کے وار سے محفوظ ہوجائیں گے۔

دوسری مثال

چاندمل چوپڑا نے ۱۹۸۵ میں بنگال ہائی کورٹ میں ایک رِٹ کی اپیل داخل کی۔ اس میں ہائی کورٹ سے کہا گیا تھا کہ وہ دستور ہند کی دفعہ ۲۲۶ کے تحت حکومت مغربی بنگال کے نام ہدایت جاری کرے کہ وہ قرآن کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی عائد کردے۔ چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کے انگریزی ترجموں سے مختلف آیتیں نقل کی تھیں اور کہا تھا کہ یہ آیتیں اپنے پڑھنے والے کے اندر لڑائی کی اسپرٹ ابھارتی ہیں اور اس طرح ملک کے اندر قیام امن میں رکاوٹ ہیں۔

چاندمل چوپڑہ کی یہ درخواست بلاشبہ لغو تھی، اور اس کی اسی لغویت کی بنا پر مسٹر جسٹس باسک نے ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو اس کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ کہہ کر اسے خارج کردیا:

... for the aforesaid reasons this application stands dismissed (Para 40).

چاندمل چوپڑا کے دعوے کی بنیاد دوبارہ قرآن کے وہ ترجمے تھے جن میں کثرت سے غلطیاں اورخامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کی سورہ الحج (آیت ۳۹) کا حوالہ دیا تھا۔ اس آیت کا ترجمہ محمد مارڈیوک پکتھال نے ان الفاظ میں کیا ہے:

Sanction is given unto those who fight ...

اس ترجمہ سے بظاہر یہ نکلتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو لائسنس دے رہا ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑیں اور ان سے جنگ وقتال کریں۔ اور اسی ترجمہ کو چاندمل چوپڑا نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ مگر یہ ترجمہ بجائے خود غلط ہے۔ قرآن کا اصل لفظ یقاتَلون (ت پر زبر) ہے، مگر مترجم نے اس کے برعکس یقاتِلون (ت پر زیر) کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے آیت کا مطلب بالکل الٹ گیا۔ اس آیت کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا:

Sanction (to take up arms) is given to those who are attacked ...

قرآن کے اصل لفظ (اور اس کے صحیح ترجمہ کے مطابق) اس آیت میں دفاع کے طور پر لڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر غلط ترجمہ کے نتیجہ میں یہ آیت جارحانہ جنگ کے ہم معنی بن گئی، اور چاندمل چوپڑا جیسے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس غلط ترجمہ کو لے کر اسلام کو خونخوار مذہب ثابت کریں اور عدالت سے لے کر پریس تک اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد خود مسلمانوں نے کیا کیا۔ مسلم اخبارات نے چاندمل چوپڑا کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کیے اور مسلم لیڈروں نے اس کو ایک خطرناک سازش ظاہر کرنے کے لیے خطابت کا سارا زور صرف کر دیا۔ مگر مسلمانوں میں سے کوئی بھی تنظیم یا کوئی بھی قابل ذکر شخصیت ایسی نہیں نکلی جس کو یہ واقعہ بے تاب کر دے کہ انگریزی زبان میں قرآن کا کوئی صحیح اور قابل اعتماد ترجمہ موجود نہیں۔ اور پھر وہ اس منصوبہ پر عمل شروع کر دے کہ ایک صحیح اور قابل اعتماد انگریزی ترجمہ تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ چاندمل چوپڑا جیسے

فتنوں کی جڑ ہمیشہ کے لیے کٹ جائے۔

ملت کی کہانی

یہ دو مثالیں محض منفرد مثالیں نہیں۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی پوری کہانی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ اصل کمزوری کیا ہے جس نے ان کو موجودہ زمانہ میں بربادی سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ پچھلی نصف صدی سے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں ـــــ دوسروں کو نشانہ بنا کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا۔ وہ اپنی داخلی اصلاح اور اپنے اندرونی استحکام کے میدان میں کوئی حقیقی کام انجام نہ دے سکے۔

قرآن کا یہ فیصلہ (آل عمران ۱۲۰) ہے، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ جب بھی کوئی خارجی طاقت کسی گروہ کو نقصان پہنچائے تو یہ درحقیقت خود نقصان پذیر گروہ کی داخلی کمی کی بنا پر ممکن ہوتا ہے۔ خربوزے کا کٹنا چھری کی سنگ دلی سے زیادہ خربوزے کی اپنی کمزوری (Vulnerability) کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ تمام عقل مند لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں کہ جب وہ کسی خارجی عنصر کی طرف سے کسی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں تو فوراً وہ اپنے کمزور پہلو (Vulnerable point) کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، تاکہ اس کی اصلاح کر کے خارجی زیادتیوں کے خلاف بند بنا سکیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی نادانی کے ساتھ صرف دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی داخلی کمیوں کو درست کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر اب تک ان کے احوال درست نہ ہو سکے۔

اس معاملہ میں پوری مسلم ملت نے حبل اللہ کو کھو دیا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھیے، تو موجودہ مسلمان سب کے سب دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے احتجاجی سیاست کو بطور قیادتی پیشہ کے اختیار کر رکھا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو کلی یا جزئی طور پر اس قسم کی سیاست سے الگ ہیں۔ تاہم وہ پہلے طبقہ کے خلاف کھل کر نکیر نہیں کرتے، وہ ان پر مشخص اور متعین تنقید نہیں کرتے۔ اور اگر بالفرض کبھی کچھ کہتے ہیں تو ان کا یہ کہنا انھیں اس سے نہیں روکتا کہ وہ حدیث کے الفاظ میں، اس کے اکیل اور خلیط

اور شریک نہ بنیں۔ گویا کہ پوری ملّت اس وقت ایک ہی کام میں مشغول ہے، اور وہ احتجاجی سیاست ہے، ایک طبقہ اس میں براہِ راست طور پر ملوث ہے اور دوسرا طبقہ بالواسطہ طور پر۔

یہ بے حد خطرناک علامت ہے۔ کیوں کہ قرآن وحدیث کے مطابق یہ وہ چیز ہے جو قوموں کو غضب الٰہی کا مستحق بنا دیتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے معاملات میں اسلام کا طریقہ احتجاج نہیں ہے بلکہ احتساب ہے۔ اس طرح کے قومی امور میں ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنی داخلی کوتاہیوں کو تلاش کر کے ان کی اصلاح میں سرگرم ہوں، نہ یہ کہ کسی خارجی عنصر کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور وغل میں مشغول ہو جائیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی غلط روش کو واضح کرنے کے لیے میں اسلامی تاریخ سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

احد کے موقع پر مکہ کے لوگ چڑھائی کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ حنین میں قبیلہ ہوازن نے دھوکا دے کر مسلمانوں کے اوپر حملہ کر دیا تھا۔ ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس اعتبار سے بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ دونوں معاملات میں مسلمانوں کے نقصان کی ساری ذمہ داری فریق ثانی پر ڈال کر صرف اسی کو برا بھلا کہا جائے۔ مگر اس کے باوجود قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ تمہاری فلاں فلاں کمزوریوں نے فریق ثانی کو یہ موقع دیا کہ وہ تمہارے خلاف اپنے دشمنانہ منصوبہ میں کامیاب ہو سکیں۔

غزوۂ احد ۳ھ میں ہوا، اور غزوۂ حنین ۸ھ میں۔ یہ دونوں واقعات خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ چنانچہ ان دونوں کے بارے میں قرآن میں تبصرہ نازل ہوا۔ اس لحاظ سے یہ دونوں معیاری نمونے ہیں جن پر ہمیں اپنے مسائل کو جانچنا چاہیئے۔

اس اعتبار سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ قرآن کا انداز سراسر اس کے برعکس ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین نے اختیار کر رکھا ہے۔ موجودہ مسلم قائدین کی روش کے خلاف، قرآن نے فریق ثانی کے "ظلم اور سازش" کے بارہ میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے دونوں لڑائیوں کے نقصان کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی بعض کمزوریوں پر ڈالی۔ احد کے واقعہ کے بارے میں قرآن نے یہ کہا کہ تمہارے اختلاف ونزاع (آل عمران ۱۵۲) کی وجہ سے تمہیں یہ

نقصان اٹھانا پڑا ۔ اسی طرح حنین کے بارہ میں قرآن نے اعلان کیا کہ اس موقع پر تمہیں جس نقصان سے دوچار ہونا پڑا ، اس کا سبب تمہارا فخر اور عجب (التوبہ ۲۵) تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر خدائی پکڑ سے ڈرتے ہوں اور قرآن وسنت کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں تو ان کے لیے کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے ۔ وہ اپنے مصائب کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف چیخ پکار کا موجودہ مشغلہ مکمل طور پر بند کر دیں ۔ اس کے برعکس ان کے تمام مفکرین اور رہنما صرف اس ایک مہم میں لگ جائیں کہ وہ مسلمانوں کی ان داخلی کمزوریوں کو دور کریں جس کی وجہ سے دوسروں کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ انھیں اپنے مخالفانہ عزائم کا نشانہ بنائیں اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں ۔

جس دن مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں ختم ہوں گی ، اسی دن اغیار کے تمام مخالفانہ منصوبے بے زمین ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار اپنی موت آپ مر جائیں گے ۔

آزمودہ حل

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کو ہمارے لیڈر "مسلم کش فسادات" کہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بعض ہندوؤں کی بعض مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں ہے بلکہ یہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔ مگر اس واقعہ کا سب سے زیادہ حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ اس عمومی مسلم کشی سے مسلم لیڈر صاحبان ہمیشہ مکمل طور پر محفوظ رہتے ہیں، خواہ وہ بے ریش لیڈر ہوں یا باریش لیڈر۔ ایک مسلم اخبار نے بالکل درست طور پر لکھا ہے :

"اس (فساد) میں قصور عام لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے آرام پسند لیڈروں کا ہے جو مسلمانوں سے قربانی و ایثار کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن ان میں قربانی دینے کا کوئی حوصلہ نہیں ہے۔ چالیس برسوں کے دوران مسلمانوں کو جو قربانی دینی پڑی یا زبردستی ان سے جو قربانی وصول کی گئی اس کی مثال شاید ہی دنیا کی دوسری کوئی ملت پیش کر سکے۔ لیکن ان چالیس برسوں میں ایک بھی مسلمان لیڈر کو خراش تک نہیں آئی" نقیب (پٹنہ) ۲۰ جولائی ۱۹۸۷

مسلم لیڈروں کے اپنے بیان کے مطابق اس ملک میں تقریباً نصف صدی سے مسلم کشی اور مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات ہو رہے ہیں۔ مگر بے ریش اور باریش مسلم لیڈروں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو ہلاکت اور بربادی کے اس عمومی طوفان کا شکار ہوا ہو۔ اس قتل عام میں فرزندانِ ملت تو مسلسل ذبح ہو رہے ہیں، مگر فرزندانِ قیادت پوری طرح محفوظ ہیں۔

اس تجربہ کی روشنی میں میں مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس پورے معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ کیوں کہ اس تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ہلاکت خیز فسادات کے باوجود یہاں ایک مجرب نسخہ ان کے لیے موجود ہے۔ وہ خود بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر نصف صدی سے کر رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر جس تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے ہوئے ہیں اسی تدبیر کے ذریعہ عام مسلمان بھی اس وبا سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اس معاملہ میں اپنے بچاؤ کا اس سے زیادہ کارگر نسخہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھئے کہ مسلمان لیڈر صاحبان کس طرح اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے

ہوئے ہیں۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام لیڈر صاحبان اپنی ذات کے معاملہ میں عین اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں مسلسل طور پر کی جا رہی ہے۔ البتہ جب وہ دوسروں کے سامنے آتے ہیں تو وہ اس کے برعکس تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اسٹیج پر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں، مگر اپنی ذاتی زندگی کے معاملہ میں وہ الرسالہ کی بات کو مبالغہ آمیز حد تک پکڑے ہوئے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے یہودی پیشواؤں کے بارے میں اپنے شاگردوں سے کہا تھا: فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳ : ۱-۳)

موجودہ حالات میں ہمارے لیڈر اور رہنما جو کچھ کر رہے ہیں وہ برعکس طور پر ہمارے لیے مطلوب ہو گیا ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کے ضمن میں یہ لیڈر عام مسلمانوں کو ٹکراؤ کا سبق دیتے ہیں، مگر خود اپنی ذات اور اپنی اولاد کے معاملے میں وہ ہم آہنگی کے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لیے میں حضرت مسیح کے الفاظ کو بدل کر مسلمانوں سے کہوں گا کہ تمہارے لیڈر اس معاملہ میں جو باتیں کہتے ہیں ان کو نہ سنو، البتہ وہ خود جس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں اسی کو تم بھی اپنا لو۔ اور پھر تم بھی اسی طرح محفوظ رہو گے جس طرح تمہارے تمام لیڈر محفوظ ہیں۔

چند مثالیں

ایک مسلمان لیڈر سے راقم الحروف کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ الرسالہ کے ذریعہ مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔ حالاں کہ پیغمبر اسلام کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اسلام دشمنوں سے جنگ کی۔ انھوں نے ہمیشہ اسلام دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ لیڈر کے اصل الفاظ یہ تھے:

He always took up arms against the enemies of Islam.

میں نے کہا کہ آج کل ساری دنیا میں جہاد کے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں اور "دشمنانِ اسلام" کے درمیان لڑائی جاری ہے۔ آپ ہتھیار خریدیئے اور کسی جگہ کا انتخاب کر کے میدانِ

جہاد میں کود پڑے ہیں۔ اب ان کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا رہا ہوں تاکہ وہ ڈاکٹر اور انجینیر بن کر قوم کی خدمت کریں۔ کیا یہ جہاد نہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مسلمان لیڈروں کے فسادات سے محفوظ رہنے کا ایک راز یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کے سامنے پرجوش تقریریں کرکے انھیں لڑائی کے میدان میں بھیج رہے ہیں اور خود اپنے بچوں کو اس قسم کے جھگڑوں سے دور رکھ کر تعلیم کے میدان میں مصروف کیے ہوئے ہیں۔ اب عام مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو پرامن "جہاد" کے میدان میں لگا دیں۔ اس کے بعد وہ بھی اسی طرح فسادات کی زد سے محفوظ رہیں گے جس طرح ان کے لیڈر اور لیڈر صاحبان کے بیٹے بیٹیاں محفوظ ہیں۔

ہمارے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ عمل کے بزدل ہیں اور الفاظ کے بہادر۔ اس پالیسی سے ان کو یہ زبردست فائدہ ہو رہا ہے کہ "قتل عام" کے ماحول میں بھی وہ اور ان کے گھر والے قتل ہونے سے پوری طرح بچے ہوئے ہیں۔ پھر کیوں نہ عام مسلمان بھی اسی پالیسی کو اختیار کرلیں۔ ایسا کرکے وہ صرف اپنے لیڈروں کی پیروی کریں گے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں ایک بے حد سبق آموز مثال وہ ہے جو راقم الحروف نے اپنی کتاب (حل یہاں ہے) میں درج کی ہے۔ یہ مثال تفصیلی صورت میں کتاب کے صفحہ ۴۲-۴۵ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مسلم لیڈر صاحبان کی ایک جماعت ۶۷-۱۹۶۶ کے درمیان بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھی۔ اس تحریک کا مرکز شمالی ہند تھا۔ انھوں نے مسلم مسائل کے حل کا وہ نسخہ پیش کیا جس کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

انھوں نے کہا کہ ہمیں لڑکر اپنا حق وصول کرنا ہے۔ اس "لڑائی" کا پہلا میدان ملکی انتخاب قرار پایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کانگریس (بالفاظ دیگر ہندو قیادت) کو انتخابی میدان میں شکست دینا ہے۔ ہم جب اس طرح اپنی قوت کا مظاہرہ کریں گے تو تمام لیڈر سہم جائیں گے اور اپنے آپ کو امکانی سیاسی نقصان سے بچانے کے لیے ہمارے تمام مسائل حل کر دیں گے۔

۱۹۶۷ کے الکشن میں ضرر رسانی کے اس نسخہ کا تجربہ کیا گیا مگر یہ نسخہ مسلمانوں کے لیے ایک

فی صد بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ تاہم لیڈروں کی اس جماعت نے خود اپنے مسلہ کے لیے جو نسخہ استعمال کیا وہ انتہائی کارگر ثابت ہوا۔ یہ نسخہ کسی شاعر کے کلام سے لینے کے بجائے قرآن سے لیا گیا تھا۔ یہ نسخہ وہی تھا جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔

لیڈروں کی اس جماعت کو ایک ہمسایہ یونیورسٹی کے ہندو طلبہ سے خطرہ پیدا ہوا۔ یہاں انھوں نے ضرر رسانی کے بجائے نفع رسانی کی تدبیر استعمال کی۔ انھوں نے ان ہندو طلبہ سے ملاقاتیں کیں، اپنے یہاں ان کی دعوتیں کیں، ان کو ہیرو بنا کر انھیں انعامات دیئے۔ اس طرح ان کے دل کو جیت کر اپنے مسلہ کو حل کر لیا۔ اس پورے واقعہ کی تفصیل "حل یہاں ہے" نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ مسلمان لیڈر اگر ٹکراؤ کی باتیں کریں تو ان کی بات بالکل نہ سنو بلکہ وہی کرو جو وہ خود کرتے ہیں۔ یعنی اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے اچھے تعلقات بناؤ۔ ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آؤ، ان کے لیے نفع بخش بننے کی کوشش کرو۔ ان سے تمہیں ناخوش گواری کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنی طرف سے ان کے سامنے خوش گوار ردعمل پیش کرو، اور اس کے بعد تمہارے مسائل اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح لیڈر صاحبان کے مسائل حل ہو گیے۔

۳۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شمالی ہند کے ایک مقام پر مسلمانوں کا ایک جلسہ تھا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ ایک باریش مسلمان لیڈر نے تقریر کی۔ انھوں نے جوش و خروش کے ساتھ بابری مسجد کا ذکر کیا اور کہا کہ "بابری مسجد خون مانگ رہی ہے"۔ جب تقریر ختم ہوئی تو مذکورہ بزرگ لیڈر صاحب کے پاس گیے اور کہا کہ اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا ہے کہ بابری مسجد خون مانگ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا اور جاننا چاہتا ہوں کہ کس کا خون، میرے بچوں کا یا آپ کے بچوں کا۔ لیڈر صاحب نے کہا کہ میرا تو صرف ایک بچہ ہے اور وہ اس وقت عرب میں زیر تعلیم ہے۔ مذکورہ صاحب نے کہا تو گویا آپ اپنی اولاد کو تو تعلیم و ترقی کے میدان میں سرگرم کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کی اولاد کو کٹنے مرنے کے میدان میں سرگرم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر لیڈر صاحب بگڑ گیے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے تمام لیڈر صرف الفاظ کا جہاد کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں کو جوش

دلاتے ہیں کہ وہ آگ کے سمندر میں کود پڑیں۔ مگر خود اپنے بچوں کو لے کر دور ساحل پر کھڑے رہتے ہیں۔ یہی سادہ سا راز ہے جس نے ان لیڈروں کو فسادات کی تباہی سے بچا رکھا ہے۔ اب مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ لیڈر کے الفاظ کو الفاظ سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ وہ خود بھی وہی کریں جو لیڈر لوگ کرتے ہیں، وہ ہرگز وہ نہ کریں جو لیڈر لوگ کہتے ہیں، اور اس کے بعد وہ ہر تباہی سے مکمل طور پر محفوظ رہیں گے۔

۴۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر ہیں۔ پہلے وہ اپنے محلہ میں بالکل بے محابا طریقہ سے رہتے تھے۔ کسی کی بات انھیں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بات بات میں دوسروں سے لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اس کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ جلد جلد تین بچے پیدا ہوگئے۔ یہ بچے کچھ بڑے ہوئے تو گھر کے باہر محلہ میں چلنے پھرنے اور کھیلنے لگے۔ اب لیڈر صاحب کے اندر ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ میں اکثر گھر سے باہر رہتا ہوں۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں ہے۔ میرے بچے اکثر کھیلنے کے لیے یا کسی کام کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ اگر میں پہلے کی طرح محلہ والوں سے لڑائی جاری رکھوں تو اس کا خمیازہ میرے بچوں کو بھگتنا پڑے گا۔ جس شخص کو بھی مجھ سے شکایت پیدا ہوگی وہ اس کا انتقام میرے چھوٹے بچوں سے لے گا۔ اس سوچ کا آنا تھا کہ لیڈر صاحب بالکل بدل گیے۔ جس محلہ میں پہلے وہ لڑ بھڑ کر رہنے کا نظریہ اپنائے ہوئے تھے وہاں اب وہ میٹھے بول بول کر اور مل جل کر رہنے کے نظریہ پر عمل کرنے لگے۔

ان کی اس تبدیلی کو دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا: جناب اب تو آپ بالکل بدل گیے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آپ وہی شخص ہیں جو پہلے تھے۔ لیڈر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: بھائی، میرے بچوں نے مجھ کو بزدل بنا دیا۔

ہمارے تمام لیڈر قوم کے بچوں کو بہادری کا سبق دیتے ہیں۔ مگر خود اپنے بچوں کے لیے وہ بزدل بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کا یہی وہ راز ہے جس نے تمام لیڈروں کو ذاتی نقصان سے بچا رکھا ہے۔ اب قوم کو چاہیے کہ وہ لیڈروں کی پرجوش تقریروں پر دھیان نہ دے۔ وہ خود بھی "بزدلی" کے اسی نسخہ کو اپنا لے جس کو اپنا کر ہمارے تمام لیڈر ترقی اور کامیابی کے منازل طے کر رہے ہیں۔

اس کے بعد کوئی نقصان پہونچانے والا ان کو نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

۵۔ لیڈر صاحبان عام طور پر مسلمانوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم کو دب کر نہیں رہنا ہے، اگر تم دب گیے تو لوگ تم کو اور زیادہ دبائیں گے۔ یہاں تک کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں گے۔ مگر یہی لیڈر حضرات اس وقت دبنے کے طریقے پر عمل کر کے اپنے مسئلہ کو حل کرتے ہیں جب کہ خود ان کا ذاتی معاملہ زد میں آگیا ہو۔

ایک لیڈر صاحب کا ایک ادارہ تھا۔ اس ادارہ کے احاطہ میں امرود کا ایک باغ تھا۔ قریب کے محلہ کی ایک گائے اس باغ میں گھس آئی۔ مسلم باغبان نے گائے کو بھگانے کے لیے اسے مارا۔ اتفاق سے اس کو گردن کے پاس سخت چوٹ آگئی۔ اس کے بعد جب وہ بھاگنے لگی تو باغ کے کنارے کے خاردار تار میں پھنس کر وہ اور زیادہ زخمی ہو گئی۔

یہ گائے جب اپنے ہندو مالک کے گھر پہونچی تو اس کے خون آلود جسم کو دیکھ کر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جب معلوم ہوا کہ مسلم ادارہ کے آدمی نے اس کو مارا ہے تو محلہ کے لوگ سخت مشتعل ہو گیے۔ ایک بڑا مجمع ادارہ کے احاطہ میں گھس آیا۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا اور یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ مارنے والے آدمی کو ان کے حوالہ کیا جائے۔ اس دوران میں وہ آدمی باغ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور ادارہ کے ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ ادارہ والوں نے دیکھا کہ اس وقت یہ مجمع سخت غصہ میں ہے، اس لیے اس وقت آدمی کو ان کے حوالے کرنا مناسب نہ ہوگا۔ وہ مجمع کی اشتعال انگیزی سے مشتعل نہیں ہوئے۔ انھوں نے حکیمانہ گفتگو کر کے اس کو ایک دن کے لیے ٹال دیا۔ اور کہا کہ آپ ہمیں ایک دن کا موقع دیجیے۔ ہم اس آدمی کو تلاش کر کے کل تک ضرور اس کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔

مجمع کو واپس کرنے کے بعد ادارہ کے لوگوں نے باغبان کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو، ایک طرف تمہاری ذات ہے اور دوسری طرف ایک پورا مسلم ادارہ ہے اگر وہ تم کو نہیں پاتے ہیں تو وہ اپنا غصہ سب لوگوں پر اتاریں گے۔ تم ہمت کر کے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کرو کہ گائے کے مالک کے یہاں جا کر حاضر ہو جاؤ اور اپنی غلطی کا اقرار کر لو۔ ان سے کہو کہ یہ میری ذاتی غلطی ہے، آپ مجھ کو جو سزا چاہیں دیں۔ اگر وہ لوگ کچھ جذبہ میں آکر تمہیں ڈانٹیں ماریں تو اس کو بھی برداشت

کرلینا۔ چنانچہ اگلے دن وہ آدمی گائے کے مالک کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں وہ مجھ کو منظور ہے۔

انسان بہر حال انسان ہے۔ باغبان جب اس طرح حاضر ہو گیا اور اس نے سیدھے طور پر غلطی کا اعتراف کرلیا تو گائے والوں کے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ گیے۔ انھوں نے کہا کہ خیر اب جاؤ۔ اگر کل تم مل گیے ہوتے تو ہم تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اب گائے کو ہم نے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ اگر وہ مر گئی تو البتہ تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۷)

اس طرح ایک معاملہ جو ایک مسلم ادارہ بلکہ پورے شہر میں آگ لگا سکتا تھا، وہ نہایت آسانی سے وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ ادارہ والوں نے جس تدبیر کا تجربہ اپنے ذاتی معاملہ میں کیا اسی کا سبق اگر وہ پوری قوم کو اس طرح کے معاملات میں دیں تو کتنے ہوتے والے حادثات ہونے سے رہ جائیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قائدین اپنے ذاتی معاملات کو حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملت کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم خدا کے فوجدار ہو، کسی کی پروا کیے بغیر مجاہدانہ طور پر لڑ جاؤ۔ تاہم مسلمانوں کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس معاملہ میں وہ لیڈروں کی تقریروں کو ہرگز نہ سنیں، وہ ان کے عمل کو دیکھیں۔ یہ لیڈر صاحبان جس طرح خاموش تدبیر سے اپنے ذاتی معاملہ کو حل کرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی اپنے معاملات کو حل کریں، اور اس کے بعد انشاءاللہ وہ ہر فساد سے محفوظ ہو جائیں گے۔

۶۔ عرب کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ پہلے وہ ہندستان میں مسلمانوں کے درمیان لیڈری کرتے تھے۔ اس کے بعد انھیں عرب میں ایک اچھا کام مل گیا اور وہ وہاں منتقل ہو گیے۔ آج کل وہ عرب میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہندستان کیسا وحشی ملک ہے۔ وہاں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں کسی مسلمان کی جان و مال محفوظ نہیں۔ آپ دیکھئے ہم لوگ یہاں کتنے سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ یہاں کا نظام آپ کو جو کچھ دے رہا ہے اس کا آپ

نے ذکر کیا، مگر آپ خود یہاں کے نظام کو جو کچھ دے رہے ہیں، اس کا ذکر کرنا آپ بھول گیے۔ میں نے کہا کہ آپ جس ڈھنگ سے عرب میں رہتے ہیں، اگر ہندستان کے مسلمان اسی ڈھنگ سے ہندستان میں رہیں تو وہ ہندستان میں بھی اسی طرح باعزت طور پر رہ سکتے ہیں جس طرح آپ عرب میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ عرب میں آپ کے پرسکون طور پر رہنے کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ یہاں کے نظام کے ساتھ کامل توافق (Adjustment) ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے ملک کے نظام سے اسی طرح توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ رہیں تو ایک دن میں سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

میں نے کہا کہ ساری عرب دنیا میں وطنی کے مقابلہ میں خارجی کو نمبر ۲ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ یہاں ایک ہندستانی کے مقابلہ میں ایک امریکی کو کئی گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے مگر آپ اس امتیاز کو گوارا کیے ہوئے ہیں۔ یہاں آپ کو یہ اجازت نہیں کہ مسجد میں یا مسجد کے باہر لاؤڈ اسپیکر لگا کر تقریر کریں۔ یہاں آپ نہ کوئی آزاد اخبار نکال سکتے اور نہ کوئی آزاد رسالہ چھاپ سکتے ہیں مگر اس کے خلاف آپ جیل بھرنے کی مہم نہیں چلاتے۔ یہاں واضح طور پر بہت سے غیر شرعی امور پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر ان کے بارہ میں آپ بالکل خاموش ہیں۔ آپ حضرات اس قسم کی چیزوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے اور نہ ان مسائل پر کوئی جلوس نکالتے۔

میں نے کہا کہ عرب میں آپ کو جو پر سکون زندگی حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں کے نظام سے ہم آہنگی اختیار کر کے آپ نے اس کی ضروری قیمت ادا کر دی ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر راضی ہو جائیں تو وہاں بھی وہ عزت اور کامیابی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں، حتی کہ ان کے اکابر جو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے لیے عرب کے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں عام ہندستانی مسلمانوں کے لیے زبردست سبق ہے۔ یہ مسلمان اور یہ اکابر عرب میں جا کر جس طرح وہاں کے نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں، اسی طرح ہندستانی مسلمان بھی ہندستان کو اپنا ملک سمجھیں اور یہاں کے حالات

سے موافقت کرکے زندگی گزاریں۔ اس کے بعد انشاءاللہ ان کے لیے یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

۷۔ ایک لیڈر صاحب ہیں۔ لیڈر ہونے کے ساتھ وہ ایک اسلامی ادارہ بھی چلاتے ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ یہ لیڈر صاحب اپنی پرجوش تقریروں میں اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ہمیشہ "اینٹی گورنمنٹ" لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وزیروں اور گورنروں کی پروا نہیں کرتا۔ میں صرف خدا کی پروا کرتا ہوں اور اسی سے ڈرتا ہوں۔ حکمرانوں سے استغنا برتنا اور انھیں نظرانداز کرنا ان کا خاص کمال سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اس قسم کی تقریروں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حلقہ کے لوگوں میں عام طور پر یہ ذہن بن گیا ہے کہ جو شخص حکمرانوں سے قریب ہو یا ان کے حق میں بھلائی کا کلمہ کہے تو وہ یقینی طور پر ابن الوقت اور موقع پرست ہے۔

مذکورہ لیڈر صاحب کا یہ انداز وہ ہے جس کو وہ اپنی تقریروں میں برتتے ہیں۔ مگر خود اپنے عملی معاملات میں ان کا طریقہ سراسر اس سے مختلف ہے۔ مثلاً ان کے ادارہ اور شاہراہِ عام کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں ایک ایسی سڑک بن جائے جو ادارہ کو شاہراہ عام سے جوڑ دے تاکہ سفر آسان ہو سکے۔

بہ ظاہر یہ ایک مشکل کام تھا، مگر ان کے زرخیز ذہن نے اس کا نہایت خوبصورت حل دریافت کر لیا۔ انھوں نے اپنے ادارہ کے احاطہ میں ایک "بین اقوامی" کانفرنس کی جس میں عرب کے کئی شیوخ بھی شریک ہوئے۔ اب لیڈر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک باضابطہ دعوت نامہ تیار کیا جس میں ریاست کے ہندو چیف منسٹر کو "خصوصی مہمان" کے طور پر کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چیف منسٹر صاحب نے بخوشی یہ دعوت قبول کر لی۔ وہ جب اپنی سرکاری کار سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تو انھیں غیر معمولی اعزاز دیا گیا۔ مگر انھیں یہ دیکھ کر شرم آئی کہ بیرونی ملکوں کے مہمان ان کے شہر میں آئیں اور ان کو اجتماع گاہ تک پہنچانے کے لیے معقول راستہ موجود نہ ہو۔ لیڈر صاحب کے ساتھیوں نے چیف منسٹر کے اس احساس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جلد ہی وہاں ادارہ اور شاہراہ عام

کے درمیان ایک عمدہ سڑک تعمیر ہوچکی تھی۔

اب میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ آپ کے لیڈر اگر حکمرانوں کے خلاف تقریر کریں تو آپ ہرگز ایسی تقریروں کو سنجیدہ طور پر نہ لیں۔ آپ سرکاری افسروں اور حکام سے اچھے تعلقات رکھیں اور اس کے بعد آپ کے سب کام اسی طرح بخوبی طور پر انجام پا جائیں گے جس طرح لیڈروں کے اپنے کام بخوبی طور پر انجام پا رہے ہیں۔

۸۔ شریمتی سبھدرا جوشی (پیدائش ۱۹۱۹) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انھوں نے کرسچین کالج لاہور سے پولٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر ملکی سیاست میں شامل ہوگئیں۔ وہ مہاتما گاندھی کی ساتھیوں میں سے ہیں۔

سبھدرا جوشی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ ۱۹۴۷ کے فسادات میں ہم دہلی کے مسلم محلوں میں کام کر رہے تھے۔ دلی کانگریس پر ہمارا قبضہ تھا۔ گاندھی جی آئے۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کتنے مسلمان مارے گئے۔ ہم نے بتایا: دس ہزار سے زیادہ مارے گئے ہیں۔ وہ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ تم نے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ہم نے کہا، ہم تو برابر کوشش کر رہے ہیں، مگر حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ انھوں نے غصہ میں پوچھا، ان دس ہزار میں تمہارے کانگریسی ورکر کتنے مارے گئے۔ ہم نے جواب دیا ایک بھی نہیں۔ اس پر وہ بولے "پھر میں کیسے مان لوں کہ تم نے بچانے کی کوشش کی ہوگی" (ماہنامہ شبستاں، دہلی، جون ۱۹۷۲)

گاندھی جی کے اس تبصرہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ لیڈر لوگوں نے فساد زدہ عوام کو بچانے کا کام ہی نہیں کیا، وہ بس دور دور سے اس کا کریڈٹ لیتے رہے۔ اگر واقعۃً وہ فساد زدہ عوام کو بچانے کی کوشش کرتے تو جس طرح دوسرے لوگ مارے گئے وہ بھی انھیں کے ساتھ مارے جاتے۔

اس پہلو سے قطعِ نظر، اس واقعہ میں ایک اور سبق ہے۔ وہ یہ کہ لیڈر لوگوں کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہوتا ہے کہ عین اس وقت بھی لیڈروں میں سے کوئی لیڈر مارا نہ جائے جب کہ دوسرے لوگ دس ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مار ڈالے گئے ہوں۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ لیڈروں کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کریں۔ اگر انھوں نے اس راز کو جان لیا تو انھیں یہ شکایت

کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کہ ان کا جان و مال اس ملک میں غیر محفوظ ہے۔

اگر آپ لیڈر صاحبان کی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لیڈروں کے محفوظ رہنے کا نسخہ وہی حکمت اور احتیاط کا طریقہ ہے جو الرسالہ میں پچھلے دس سال سے پیش کیا جارہا ہے۔ یہ لیڈر صاحبان بظاہر الرسالہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہیں مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ پوری طرح اس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ پھر آپ بھی کیوں نہ اسی حفاظتی طریقہ کو اپنا لیں۔ ایسا کرکے آخر کار آپ وہی کریں گے جو آپ کے لیڈر بہت پہلے سے کر رہے ہیں۔

۹۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک ریاست میں سرکاری ملازم ہیں۔ ایک بار وہ اپنے محکمہ کے کام سے دہلی آئے۔ درمیان میں انھیں اپنے "چیف" سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انھوں نے دہلی سے ٹرنک کال کیا۔ جب وہ ٹیلی فون پر اپنے چیف سے بات کر رہے تھے تو میں نے سنا کہ ان کی زبان سے صرف "ہاں صاحب، جی صاحب"، "ہاں صاحب، جی صاحب" کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ اپنے چیف سے سیکڑوں میل دور تھے۔ مگر حال یہ تھا کہ بات کرتے ہوئے کرسی سے اٹھے چلے جارہے تھے، جیسے کہ چیف صاحب خود ان کے سامنے موجود ہوں۔

"ہندو چیف" سے جب ان کی بات ختم ہوگئی تو ان سے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع ہوئی۔ اس درمیان میں الرسالہ کا نام آیا۔ ان کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ انھوں نے کہا آپ تو پوری قوم کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے الرسالہ کا سخت مخالف ہوں۔" انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ اسلام ہمیشہ اقدام کی تعلیم دیتا ہے۔ اور آپ مسلمانوں کو انفعالی روش کی طرف لے جانا چاہتے ہیں:

Islam stands for an active approach in all matters
and forbids all that leads to a passive surrender.

میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھ میں اور آپ میں جو فرق ہے وہ نقطۂ نظر کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ اصلی فرق یہ ہے کہ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی ہیں اور میں ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی نہیں۔ میرا ایک ہی اصول ہے، ایک معاملہ میں بھی اور دوسرے معاملہ میں بھی۔

انھوں نے بگڑ کر کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے ۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے ذاتی معاملہ میں مفاہمت کے اصول پر قائم ہیں ۔ اور دوسروں کو ٹکراؤ کے راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں ۔ آپ کا سابقہ جن ہندوؤں (اعلیٰ افسران) سے پڑتا ہے ان کے ساتھ آپ مبالغہ آمیز حد تک اسی نرم روش کو اپنائے ہوئے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں کی جاتی ہے ۔ دوسری طرف مسلمانوں کے معاملہ میں یہ چاہتے ہیں کہ ان کا سابقہ جن ہندوؤں سے پڑے ان کے مقابلہ میں وہ آخری حد تک کرٹے بن جائیں ۔

مذکورہ مسلم دانشور اور ان کے جیسے دوسرے تمام مسلمانوں کے معاملات پوری طرح درست ہیں ۔ ان کے بچے اعلیٰ ڈگریاں لے کر بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر رہے ہیں ۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ لڑائی بھڑائی کی باتیں کرتے ہیں ، مگر عملاً اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو لڑائی بھڑائی سے سیکڑوں میل دور رکھتے ہیں ۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ بھی اسی طریقہ کو اپنالیں ۔ تصادم اور اقدام ، جیسی باتوں کو وہ صرف کہنے کی بات سمجھیں وہ ہرگز انھیں اپنا عملی پروگرام نہ بنائیں ۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا اور ان کے بچوں کا مستقبل بھی اسی طرح محفوظ رہے گا جس طرح ہمارے رہناؤں اور دانشوروں کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہے ۔

خلاصہ

اوپر جو کچھ کہا گیا ، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے "قتل عام" کے باوجود خود مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کو اب بھی اس ملک میں حفاظتِ عام حاصل ہے ۔ یہ طبقہ مسلم لیڈروں کا ہے ۔ یہ دراصل مسلم لیڈر ہی ہیں جو ہندستان میں مذکورہ " قتل عام " کا انکشاف کرتے رہتے ہیں ۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود مسلم لیڈر اس قتل عام سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

ہم مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر کرتے ہیں ۔ لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ۔ فرقہ وارانہ نقصان سے بچنے کے لیے مسلمان بھی اپنے لیڈروں کی اسی آزمودہ تدبیر کو اختیار کرلیں ۔ مسلمان اپنے لیڈروں کے قول کو نہ دیکھیں بلکہ وہ صرف ان کے عمل کو دیکھیں ۔ اس معاملہ میں لیڈر لوگ دوسروں سے جو کچھ کہتے ہیں اس کو وہ نظر انداز کر دیں ، اور صرف یہ پتہ لگائیں کہ وہ خود کیا کر رہے ہیں ۔

ایک سفر

کئی مہینہ پہلے کی بات ہے، مجھ کو جامنیر (ضلع جلگاؤں) سے ایک خط ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ شری ایشور لال جی جین (سابق ایم ایل اے) اپنے دادا آنجہانی راج مل لکھی چند للوانی (وفات ۱۹۷۳) کی یاد میں "لکچر سیریز" کی تقریب کر رہے ہیں۔ اس کا سلسلہ ایک ہفتہ تک جاری رہے گا۔ اس سات روزہ پروگرام میں وہ ایک اسلامی عالم کا بھی لکچر رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے راقم الحروف کا انتخاب کیا ہے۔ خط و کتابت جاری رہی یہاں تک کہ یہ طے ہو گیا کہ مجھ کو ۸ اپریل کو جامنیر پہنچ کر مذکورہ لکچر دینا ہے۔ اس پروگرام کے تحت یہ سفر ہوا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ایک خاص تاریخ یا وقت پر کسی مقام کا سفر کرنا ایک عام بات ہے۔ ساری دنیا کا کام اسی طرح ہو رہا ہے۔ مگر جب اس پر غور کیا جائے کہ ایسا کیوں کر ممکن ہوتا ہے تو معلوم ہو گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس نے ہمیشگی طور پر مقررہ پروگرام کے تحت سفروں کو انسان کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ یہ ہے سورج اور چاند اور زمین کی گردش کا نظام۔ اگر یہ نظام نہ ہو تو تعیین وقت کے ساتھ کوئی کام کرنا ناممکن ہو جائے۔ یہی وہ عظیم نعمت ہے جس کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: اللہ ہی جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو نور عطا کیا اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو (یونس ۵)

۸ اپریل کی صبح کو فلائٹ نمبر ۴۹۱ کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ یہ بوئنگ ۷۳۷ تھا۔ "بوئنگ" امریکہ کی مشہور جہاز ساز کمپنی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جہاز سازی کی صنعت میں امریکہ کو اجارہ داری حاصل ہے۔ دنیا کے بیشتر سفر امریکی کمپنیوں کے جہاز ہی پر ہوتے ہیں۔ آپ امریکہ کی مخالف کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پرواز کریں تب بھی اغلب ہے کہ آپ امریکہ ہی کے بنے ہوئے جہاز پر سفر کر رہے ہوں گے۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو آسمان میں تیرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا

چاہے جہاں جاکر برسس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا (امطری حیث شئت فسیاتینی خراجك)
؟ اگر امریکہ کہنا چاہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ تم جو بھی سفر کرو خواہ میرے موافق یا میرے خلاف ،
ںکا ٹیکس آخرکار میرے ہی پاس آئے گا۔

تقریباً یہی صورت حال ہمارے ملک میں اکثریتی فرقہ کی ہورہی ہے۔ ہندستان کے تمام
بارتی شعبوں پر اکثریتی فرقہ کا قبضہ ہوچکا ہے۔ پچھلے سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یہاں اکثریتی فرقہ
لی حیثیت "دکاندار" کی ہوگئی ہے اور اقلیتی فرقہ کی حیثیت "خریدار" کی۔ یہ سب سے بڑا حادثہ
ہے جو اقلیتی فرقہ کی جدید تاریخ میں اس کے ساتھ پیش آیا ہے۔

۳۰ مارچ کو راجدھانی میں اقلیتی فرقہ کی ایک "عظیم الشان ریلی" تھی۔ یہ ریلی اکثریتی فرقہ
لی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر کی گئی تھی۔ ریلی میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ مجھ سے
ملنے کے لیے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی ریلی میں کتنے آدمی شریک ہوئے۔ انھوں نے
پُرفخر طور پر کہا کہ کم ازکم پانچ لاکھ۔ میں نے پوچھا کرسشہ کا، کا خرچ فی کس کتنا ہوگا۔ ان کا اندازہ
تھا کہ فی کس اوسط خرچ ایک سو روپیہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ پانچ لاکھ آدمی اگر فی کس ایک سو
روپیہ خرچ کریں تو کل کتنی رقم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پانچ کرور۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ
ہے کہ آپ نے صرف ایک دن میں پانچ کرور روپے خرچ کر دیئے۔ اب اگر اس صورت حال کو
سامنے رکھا جائے کہ اس ملک میں دولت کی گردش یک طرفہ ہوگئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ
اقلیتی فرقہ نے صرف ایک دن میں پانچ کرور روپے اپنی جیب سے نکال کر اکثریتی فرقہ کی جیب
میں ڈال دیئے۔ اقلیتی فرقہ کو تو کچھ نہیں ملا۔ مگر اس فرقہ کو اس کا پورا حصہ مل گیا جس کے
خلاف آپ نے احتجاج کیا تھا۔

ہندستان بظاہر بیل گاڑی کے سفر کے دور سے نکل کر ہوائی جہاز کے سفر کے دور میں
داخل ہوگیا ہے۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں سے تقابل کیجئے تو ہندستان کی ہوائی سروس نہایت
ناقص نظر آئے گی۔ حتی کہ یہاں کے ہوائی جہازوں میں بعض اوقات ایسے عجیب وغریب لطیفے
پیش آتے ہیں جو ترقی یافتہ ملکوں میں ناقابل تصور سمجھے جاتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۸۷ کے اخبارات میں ایک خبر حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ شائع

ہوئی :

Vayudoot Plane doof opens in mid-air

یعنی وایا دوت جہاز کا دروازہ فضا میں کھل گیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو وایو دوت کا ایک جہاز (PF-102) ۱۵ مسافروں کو لیے ہوئے لدھیانہ سے دہلی جا رہا تھا۔ اچانک ایک شور کے ساتھ تیز ہوا جہاز کے اندر داخل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا دروازہ کھل گیا ہے۔ مسافروں میں زبردست گھبراہٹ پھیل گئی۔ تاہم ہوائی جہاز محفوظ طور پر اگلے ہوائی اڈہ پر اتار لیا گیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔ وایو دوت کا ایک جہاز کلکتہ کے ہوائی اڈہ سے اڑا مگر فضا میں پہونچنے کے بعد اس کا دروازہ کھل گیا۔ تاہم اس بار بھی کوئی جانی نقصان پیش نہیں آیا۔ اس کا پائلٹ حفاظت کے ساتھ جہاز کو ہوائی اڈہ پر اتارنے میں کامیاب رہا۔

اس مسئلہ کو پارلیمنٹ میں اٹھاتے ہوئے ایک کانگریسی ممبر ڈاکٹر گوری شنکر راج ہنس (ٹائمس آف انڈیا ۷ اپریل ۱۹۸۷) نے کہا :

Is it Vayudoot or Yamadoot

وایو دوت پائلٹس ایسوسی ایشن کے ایک ذمہ دار نے بتایا کہ حالت پرواز میں دروازہ کھلنے کی وجہ یہ تھی کہ جہاز کے دروازے کا دستہ (Door handle) ناقص تھا۔ اور فالتو پرزوں کی کمی کی وجہ سے اس کو درست نہیں کیا جا سکا تھا۔ دوسری طرف اس سلسلے میں انگریزی اخبار انڈین اکسپریس ۵ اپریل ۱۹۸۷ (صفحہ ۳) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے :

In fact, the management of Vayudoot believes that its hangar at Palam Airport is jinxed and on April 1 a 'havan' was performed to ward off evil spirits. All top executives, including the general manager attended the function.

دراصل وایو دوت کی انتظامیہ کا یہ خیال ہے کہ پالم ایرپورٹ میں اس کے ہینگر کو نحوست

لگ گئی ہے ۔ چنانچہ یکم اپریل کو وہاں ایک ہون کیا گیا تاکہ بد روحوں کو نکالا جا سکے ۔ تمام اعلیٰ افسران مع جنرل منیجر اس تقریب میں موجود تھے ۔

ہمارے ملک کے سرکاری مشنری میں جو بدنظمی پائی جاتی ہے اس کی کم از کم ایک وجہ وہ توہم پرستی ہے جس کی ایک مثال مذکورہ بالا واقعہ میں نظر آتی ہے ۔ "جہاز" کی ناقص کارکردگی کو اگر آپ مشین کا معاملہ سمجھیں تو آپ اپنی ساری توجہ اس کی مشین کو درست کرنے میں لگادیں گے ۔ اس کے برعکس اگر آپ کا یہ عقیدہ ہو کہ "جہاز" کی ناقص کارکردگی بد روحوں کے اثر سے پیدا ہوئی ہے تو آپ بد روحوں کو نکالنے کے لیے غیر متعلق قسم کے توہم پرستانہ اعمال میں مبتلا ہو جائیں گے ۔

جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے ۸ اپریل کا انگریزی اخبار اسٹیٹسمین رکھا ہوا تھا ۔ میں نے اس کو اٹھا کر دیکھنا شروع کیا ۔ اتنے میں میرے پاس بیٹھے ہوئے ہندو بھائی نے ایک خبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : "اس کو پڑھیے" انھوں نے صرف اتنا ہی کہا ۔ مگر خبر کو پڑھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے ۔

یہ صفحہ اول کی ایک خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ۷ اپریل ۱۹۸۷ کو ہندو لوگ بہت بڑی تعداد میں رام لیلا گراؤنڈ میں جمع ہوئے اور اس بات کا عہد کیا کہ وہ اجودھیا کی رام جنم بھومی کو "آزاد" کرنے کے لیے ہر قیمت ادا کریں گے ۔ خواہ اس کی خاطر انھیں "خون کی ہولی" کھیلنی پڑے ۔ وغیرہ وغیرہ

اس ملک کے مسلمان پچھلے دو سو سال سے جو تحریک چلا رہے ہیں وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قومی تحریک ہے، اور اس لیے وہ سراسر باطل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غیر معمولی قربانیوں کے باوجود انھیں اپنی تحریکوں میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی ۔ مسلم ۔ سکھ تحریک ، مسلم ۔ انگریز تحریک ، مسلم ۔ ہندو تحریک ، یہی مسلمانوں کی پچھلی دو سو سالہ تاریخ کا خلاصہ ہے ۔ از روئے قرآن مسلمانوں کو اس ملک میں داعی ۔ مدعو تحریک چلانا چاہیے تھا مگر انھوں نے اس کے برعکس تحریکیں چلائیں ۔ مسلم ۔ سکھ ، مسلم ۔ انگریز ، مسلم ۔ ہندو تحریکوں نے مسلمانوں کے اندر ان اقوام کے خلاف نفرت اور بیزاری پیدا کی ۔ حالاں کہ یہ قومیں ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں ۔

اور مدعو کے لیے داعی کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے ۔ دوسری قوموں کو اگر ہم محبت کا تحفہ دیتے تو اس کے جواب میں ہمیں بھی ہمارے موافق تحفہ ملتا۔ مگر جب ہم نے انھیں نفرت اور بیزاری کا تحفہ دیا تو اس کے جواب میں ان کی طرف سے بھی ہم کو وہی چیز ملی جو ہم نے انھیں دی تھی ۔

اخبار کی ایک سرخی یہ تھی کہ (اشتراکی) پولینڈ نے اپنی سرکاری کمپنیوں کو نجی ملکیت میں دینے کا فیصلہ کیا ہے :

Poland to privatize State companies

اسٹاک ہام کی ڈیٹ لائن کے ساتھ اس خبر میں پولینڈ کے ذمہ داروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ پولینڈ بہت جلد اپنی کئی سرکاری کمپنیوں میں نجی افراد کو حصہ دار بننے کی پیش کش کرے گا۔ یہ ان اہم اصلاحی تبدیلیوں میں سے ہے جو پولینڈ میں وہاں کی اشتراکی معیشت کو نئی زندگی دینے کے لیے کی جارہی ہیں :

Poland will soon offer shares to private citizens in several State companies under major reforms to rejuvenate its socialist economy.

موجودہ صدی کے آغاز میں اشتراکی حضرات نے نجی معیشت کے طریقہ کو ترقی میں رکاوٹ قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ اب اسی صدی کے آخر میں انھیں عملاً یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ان کو نجی معیشت کے طریقہ کو دوبارہ اپنانا پڑے گا ورنہ ان کی قومی اقتصادیات برباد ہو کر رہ جائے گی ۔

۸ اپریل کو ۱۱ بجے ہم اورنگ آباد پہونچے ۔ یہاں جناب منہاج خاں صاحب کی رہائشگاہ پر دو گھنٹے قیام رہا۔ اس کے بعد جامنیر کے لیے روانگی ہوئی ۔ اورنگ آباد ریاست مہاراشٹر کا ایک شہر ہے ۔ اس کو ملک امبر نے ۱۶۱۰ء میں آباد کیا تھا۔ بعد کو اورنگ زیب نے اس کا نام اورنگ آباد کر دیا۔ ۱۹۵۸ میں یہاں مرہٹواڑہ یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ اورنگ زیب کا مقبرہ بھی اورنگ آباد کے پاس ہے ۔ ایلورا کے مشہور غار بھی اسی کے پاس واقع ہیں ۔

اورنگ آباد کے مختصر قیام میں شہر کے متعدد افراد ملاقات کے لیے آگئے اور مختلف

موضوعات پر تبادلۂ خیال رہا۔ بمبئی کا ایک اردو ہفت روزہ اخبار جو اپنے جذباتی بلکہ مشتعل انداز کے لیے مشہور ہے، وہ اس علاقہ میں کافی پڑھا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے کہا: یہاں کے لوگوں کا مزاج تو یہی اخبار بنا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اخبار مزاج نہیں بنا رہا ہے، بلکہ وہ بنے ہوئے مزاج کو استعمال کر رہا ہے۔ ان اخباروں میں مزاج بنانے کی طاقت نہیں۔ وہ تو صرف مسلمانوں کے بگڑے ہوئے مزاج کو استعمال کر سکتے ہیں اور وہی کر رہے ہیں۔

اورنگ آباد کی آبادی تین لاکھ ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۳۵ فی صد ہے۔ وہ یہاں ہر اعتبار سے اچھی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر میرے اندازہ کے مطابق ابھی تک وہ اپنی اس حیثیت کا مثبت استعمال نہ کر سکے۔ ان کی طاقت زیادہ تر آپس کے اختلافات اور بے فائدہ مظاہروں میں ضائع ہو رہی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل خرابی فخر کی نفسیات ہے۔ قرآن کی آیت لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کو انھوں نے بدل کر اس طرح کر دیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ مفخرۃ حسنۃ۔ جن مقامات پر مسلمان مادی اعتبار سے غیر اہم ہوں وہاں وہ دبے ہوئے رہتے ہیں۔ اور جہاں انھیں کچھ محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے وہاں ان کا مخصوص ذہن فوراً ایک جزیرۂ فخر تعمیر کر لیتا ہے۔ دونوں ہی قسم کے مقامات پر مسلمان کوئی موثر کردار ادا کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اول الذکر مقامات پر غیر ضروری احساس کمتری کی بنا پر اور ثانی الذکر مقامات پر غیر ضروری احساس برتری کی بنا پر۔

اورنگ آباد سے جامنیر کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ اورنگ آباد اور جامنیر کے درمیان سلور ہے۔ یہاں ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ یہاں کوئی پروگرام پہلے سے نہیں رکھا گیا تھا۔ مگر لوگوں کو میری آمد کی خبر ملی تو لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ ان کے اصرار پر یہاں نماز ظہر کے بعد مختصر تقریر کی۔ معلوم ہوا کہ سلور میں کافی لوگ ہیں جو برابر الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

آگے بڑھے تو ایک اور مقام آیا جس کا نام پھور ہے۔ یہاں کے لوگ بھی خبر سن کر جمع ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم لوگ کچھ دیر وہاں ٹھہریں اور تقریر کا پروگرام رکھا جائے۔ مگر وقت کی کمی کی بنا پر ہم لوگ یہاں ٹھہر نہ سکے اور آگے روانہ ہو گئے۔ پھور میں بھی الرسالہ پڑھا جا رہا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ اب محض ایک رسالہ نہیں رہا، اب وہ ایک تحریک بن چکا ہے۔

اس سفر میں مختلف مقامات پر چند پروگرام رہے۔ تاہم یہ سفر اصلاً شری ایشور لال جین (معروف بابو جی) کی دعوت پر ہوا۔ انھوں نے اپنے دادا کے نام پر ایک ہفتہ کے لیے لکچروں کا انتظام کیا تھا۔ اس پروگرام کے آخری دن میری تقریر تھی۔ میری تقریر کا موضوع یہ تھا کہ نیشنل انٹگریشن اور اس کے بارے میں اسلام کی رہنمائی۔

شری ایشور لال جین اس علاقہ کے نہایت ممتاز آدمی ہیں۔ مختصر قیام کے دوران ان سے ملک کے مسائل اور فرقہ وارانہ معاملات پر گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک صاف ذہن اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ ہر موضوع پر انھوں نے صاف گوئی کے ساتھ باتیں کیں۔ میرا خیال ہے کہ اکثریتی فرقہ کے بیشتر افراد اسی قسم کا مزاج رکھتے ہیں، مگر اقلیتی فرقہ ابھی تک اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکا کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے۔

تقریر کا پروگرام ایک کالج کے میدان میں تھا۔ وسیع میدان تقریباً پورا بھرا ہوا تھا۔ ہندو صاحبان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ بلکہ بعض لوگوں نے بتایا کہ پچھلے پروگراموں کے مقابلہ میں حاضرین کی تعداد اس دن زیادہ تھی۔ خود شری ایشور لال جین میری ڈیڑھ گھنٹہ کی

پروگرام

۸ اپریل	اورنگ آباد، ۱۱ بجے	ملاقات اور اظہار خیال	بر مکان جناب منہاج خاں صاحب
	جامنیر، بعد عصر	خطاب (مسجد اور نماز کی اہمیت)	شاہی مسجد میں
	جامنیر، بعد مغرب	خطاب عام (نیشنل انٹگریشن)	شری ایشور لال جین کے جلسہ میں
	جامنیر، بعد عشار	خطاب (قومی یک جہتی)	بمقام نیو انگلش اسکول
۹ اپریل	جلگاؤں، بعد نماز فجر	درس قرآن	جامع مسجد جلگاؤں
	جلگاؤں، ۹ بجے صبح	خطاب (سیکولر ہندستان میں مسلمانوں کا کردار)	ضلع پریشد ہال
	جلگاؤں	خطاب (تعمیر ملت)	اینگلو اردو جونیر کالج
	جلگاؤں	خطاب (توحید اور آخرت)	جامع مسجد
	اورنگ آباد، ۱۰ بجے شام	ملاقات اور اظہار خیال	مولانا آزاد کالج

تقریر کو نہایت توجہ کے ساتھ سنتے رہے اور آخر میں غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔

ان پروگراموں کی اطلاع مقامی اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اطراف کے علاقوں کے کچھ لوگ بھی آگئے اور اجتماعات میں شریک رہے۔

شری ایشور لال جین کی منعقدہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نیشنل انٹگریشن ہمارے ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کوئی بڑی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مگر میں دو چیزوں میں فرق کرتا ہوں۔ ایک ہے خود نیشنل انٹگریشن کا مقصد۔ دوسرا ہے انٹگریشن کو حاصل کرنے کا طریقہ۔ میں نیشنل انٹگریشن کے مقصد سے صد فی صد اتفاق کرتے ہوئے اس طریق کار سے اتفاق نہیں رکھتا جو آجکل نیشنل انٹگریشن کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

حال میں میں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی کتاب پڑھی۔ اس کا نام ہے:

INDIA: The Roots of Crisis (1986)

اس کتاب میں انھوں نے نیشنل انٹگریشن کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ملک میں کلچرل انٹگریشن پیدا کیا جائے۔ یعنی تمام لوگ ایک ہی کلچر کو اختیار کریں۔ یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں ہے۔ ملک میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نیشنل انٹگریشن کا ذریعہ کلچرل انٹگریشن ہے۔ مثلاً ملک کے مختلف فرقوں میں سول میرج کا طریقہ رائج کر دیا جائے، ہر فرقہ کے لوگ دوسرے فرقہ کے لوگوں سے شادی کریں وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کا نیشنل انٹگریشن سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں عام طور پر آپس کی شادی کا رواج تھا۔ پھر ان کے درمیان لڑائی کیوں ہوئی۔ پاکستانی اور بنگلہ دیشی دونوں ایک مذہب کے لوگ ہیں پھر وہ ایک دوسرے سے کیوں لڑ گیے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیشنل انٹگریشن کا تعلق قومی مزاج سے ہے نہ کہ اس قسم کے رواجوں سے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر انسانیت کے احترام کا مزاج پیدا کیا جائے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے جان و مال اور عزت کو قابلِ احترام سمجھے۔ یہ مزاج آجائے تو اپنے آپ نیشنل نٹگریشن پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر یہ مزاج نہ آئے تو کسی اور تدبیر سے نیشنل انٹگریشن کا مقصد

حاصل ہونے والا نہیں۔

یہ حل جو بتایا جاتا ہے وہ فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ فطرت کا نظام تنوع کے اصول پر قائم ہے۔ مثلاً پودوں اور درختوں کو دیکھئے۔ ہر ایک کا الگ انداز اور ہر ایک کی الگ شان ہے۔ اگر کوئی شخص تمام پودوں اور درختوں کو کاٹ کر ایک سائز کا بنانے لگے تو یہ سراسر نادانی کی بات ہوگی۔ دنیا کے باغ میں بڑے درخت بھی ہیں اور چھوٹے درخت بھی۔ بڑا درخت اگر سایہ اور لکڑی دیتا ہے تو چھوٹے درختوں کی قطاریں ہریالی میں اضافہ کرتی ہیں۔ پھول کے درخت اگر خوشبو دیتے ہیں تو اسی کے ساتھ گھاس بھی ایک اہم کام کرتی ہے۔ اگر گھاس نہ ہو تو زمین پر ہری مخمل کا فرش کون بچھائے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ یعنی ایک انسان کو کوئی خصوصیت دی ہے اور دوسرے انسان کو کوئی دوسری خصوصیت عطا کی ہے۔ ایک کا ذوق ایک ڈھنگ کا ہے تو دوسرے کا ذوق دوسرے ڈھنگ کا۔ یہ تنوع زندگی کی جان ہے۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ زندگی کی مختلف ضرورتیں پوری ہوں اور ہمہ گیر اور ہمہ جہتی ترقی ممکن ہو سکے۔ انسانوں کے اس تنوع کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمام انسانوں کے قد کو برابر کرنے کے لیے ان کے سروں کو تراشا جانے لگے۔

اس قسم کا حل موجودہ دنیا میں ناممکن ہے۔ یہ خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ ہر آدمی بذات خود ایک کائنات ہے۔ ہر آدمی کی فزیکل بناوٹ الگ ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے انگوٹھے کا نشان الگ ہوتا ہے۔ حتی کہ اب یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر انسان کے جسم کا ہر پارٹیکل دوسرے انسان کے جسم کے پارٹیکل سے جدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ تمام لوگوں کو ایک ہی رنگ میں کیسے رنگ سکتے ہیں۔ یہ تو خود نظامِ فطرت کے خلاف ہے۔ جب خالق نے انسان کے اندر کثرت رکھی ہے تو آپ کثرت کو مان کر اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں نہ کہ اس کو رد کر کے۔

اس بنا پر میں کہتا ہوں کہ نیشنل انٹگریشن کا راز کلچرل انٹگریشن میں نہیں ہے بلکہ کلچرل ایڈجسٹمنٹ میں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں روادار بنیں، اختلاف کے باوجود متحد ہونا سیکھیں۔ اس تمہید کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ

تاریخ اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بتایا کہ ہندستان کے حالات میں حقیقی نیشنل انٹگریشن کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس سفر میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ چند ملاقاتوں کا حال یہاں لکھا جاتا ہے۔

الرسالہ کے ایک قاری نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کے ہر صفحہ پر کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ الرسالہ کی اس خصوصیت نے اس کو نہایت اثر انگیز بنا دیا ہے۔ جو شخص اس کو پڑھتا ہے وہ اس سے اثر لیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ نے میری زندگی بدل دی۔ پہلے میں قرآن کو پڑھتا تھا مگر اس کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اب میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عبادت میں ایک نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ کائنات کو دیکھتا ہوں تو اس میں مجھے خالق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ حالاں کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ کئی لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے الرسالہ کے زیر اثر اپنے اختلافات ختم کر لیے اور حق داروں کو ان کے حقوق واپس کر دیئے۔

کچھ لوگوں نے "عملی پروگرام" کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح معروف قسم کا عملی پروگرام شروع نہیں کر سکتے۔ ہر عملی پروگرام کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے درمیان اس کو اٹھایا گیا ہے۔ ان کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لیا گیا ہو۔ دوسرے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ "اسلام خطرہ میں" اور "مسلمان خطرہ میں" کے عنوان کے تحت اقدامات کرتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات کے لیے کوئی ذہنی زمین بنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو بنی بنائی موجود ہے۔ موجودہ مسلمان مختلف اسباب کے تحت جھنجھلاہٹ اور احساس مظلومی کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ اب کوئی شخص جب خطرہ کی گھنٹی بجاتا ہے تو یہ بات عین انکے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ اس قسم کے نعروں سے ان کی منفی نفسیات کو غذا ملتی ہے۔ وہ جوق در جوق اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دل کھول کر اس کے لیے چندے دیتے ہیں۔ لیڈروں کی پر جوش تقریروں کو سننے کے لیے فوراً ان کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔

مگر ہم کو جو کام کرنا ہے وہ خالص تعمیری کام ہے۔ لوگ خارجی خطروں میں جی رہے ہیں،

جب کہ ہمیں ان کے اندر داخلی خطرے کا احساس پیدا کرنا ہے۔ لوگ انھیں احتساب غیر پر بلاتے ہیں۔ ہم انھیں احتساب خویش پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اب چونکہ ہمارے موافق ذہنی زمین مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے، اس لیے ہمارا کام ذہنی زمین تیار کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ دوسروں کو ذہنی زمین تیار کرنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی دن ایک نعرہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور صبح وشام میں ان کے گرد ایک بھیڑ جمع ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مظلوم کی پکار سیدھی خدا تک پہونچتی ہے اور عرشِ الٰہی کو ہلا دیتی ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں مظلوم ہیں۔ وہ پچاس برس سے ہر روز خدا سے دعا کرتے ہیں مگر اب تک ظالموں کا کچھ نہیں بگڑا۔ اب تک ان کی مظلومیت ختم نہیں ہوئی۔

میں نے کہا کہ حدیث میں جس "مظلوم" کا ذکر ہے، وہ ایسا شخص ہے جو یک طرفہ طور پر مظلوم بنا دیا گیا ہو، دوطرفہ عمل کے نتیجہ میں مظلوم ہونے والوں کا ذکر اس حدیث میں نہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان یک طرفہ قسم کے مظلوم نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ دوطرفہ ہے۔ یعنی مسلمانوں نے بھی دوسروں کے ساتھ ظلم کیا اور دوسروں نے بھی ان کے ساتھ ظلم کیا۔ ایسے لوگ خواہ اپنے کیے ہوئے ظلم سے زیادہ ظلم دوسروں کی طرف سے پائیں۔ بہر حال وہ دوطرفہ مظلوم ہیں۔ ایسے لوگ اس حدیث کا مصداق نہیں بن سکتے۔

مسلمان اگر ایسا کریں کہ وہ نہ تو اپنی طرف سے کسی ظلم کا آغاز کریں اور نہ دوسروں کے ظلم کے بعد ان کے خلاف کوئی جوابی ظلم کریں تو ان کی مظلومیت یک طرفہ ہو گی۔ ایسی حالت میں اگر وہ خدا کو پکاریں گے تو بلاشبہہ عرشِ الٰہی ان کی پکار سے ہل جائے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے بارے میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ بھارتی سرکار کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا ثبوت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی کانکریٹ ثبوت نہیں البتہ شبہہ ہے۔ میں نے کہا کہ محض شبہہ کی بنیاد پر کسی کے خلاف الزام لگانا حرام ہے۔ گویا کہ میرے خلاف ان کا الزام تو ابھی غیر ثابت شدہ ہے۔ مگر خود وہ لوگ دلیل کے بغیر اس قسم کا الزام لگا کر خود اپنے آپ کو فعلِ حرام کا مجرم ثابت کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جو لوگ اس قسم کا الزام لگاتے ہیں وہ یقینی طور پر اندھے ہیں۔ الرسالہ

میں تمام تر تعمیری باتیں ہوتی ہیں۔ آپ ساری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی نہیں بتا سکتے کہ ایک شخص تخریب کاروں کا ایجنٹ ہو، اس کے باوجود وہ اپنی قوم کو تعمیری بنیاد پر اٹھانے کی کوشش کرے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں۔ آپ کی تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے آپ کی باتوں سے صد فی صد اتفاق ہے۔ مگر بعض لوگ آپ کے بارے میں طرح طرح کی قابلِ اعتراض باتیں بیان کرتے ہیں جن سے ذہن خلجان میں پڑ جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہاں آپ نے میری کئی تقریریں سُنی ہیں۔ کیا آپ نے ان میں کوئی خلاف بات پائی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ ہر مہینہ میرے دو رسالے (اردو، انگریزی) نکلتے ہیں، کیا ان میں آپ کو کوئی خلاف بات ملی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ میری تقریباً پچاس کتابیں چھپ چکی ہیں، کیا ان میں آپ نے کوئی خلاف بات پائی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ بس تو پھر آپ اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دیجئے۔ جو شخص سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر آپ سے لغو باتیں کہتا ہے اس سے کہیے کہ تم جھوٹے ہو۔ اگر تم کو اعتراض کرنا ہے تو مطبوعہ باتوں کی بنیاد پر اعتراض کرو۔ سُنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کیا ہوا تمہارا اعتراض سراسر ناقابلِ لحاظ ہے۔ وہ خود تمہاری شرپسندی کو ثابت کرتا ہے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے غلط کار ہونے کو۔

ایک ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک خاص موضوع پر اپنے رسالہ کا نمبر نکالنے والے تھے اور چاہتے تھے کہ میں اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر انھیں دوں۔ میں نے کہا کہ یہ میرے لیے مشکل ہے، کیوں کہ فرمائشی مضمون لکھنا مجھ کو نہیں آتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ تو اتنے زیادہ مضامین لکھتے ہیں کہ الرسالہ میں صرف آپ کے مضامین ہوتے ہیں، اور اسی طرح وہ دس سال سے نکل رہا ہے۔ پھر ایک مضمون لکھنا آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ میرے لکھنے کا طریقہ اس سے مختلف ہے جو دوسروں کا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ حسب ضرورت ایک موضوع مقرر کیا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ میرا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ میرا مضمون میرے مطالعہ کی ضمنی پیداوار (By-product) ہوتا ہے۔

میں جب کوئی چیز پڑھتا ہوں۔ خواہ قرآن و حدیث پڑھوں یا اور کوئی چیز پڑھوں تو مطالعہ کے دوران ذہن کسی خاص پہلو کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بس اس کو میں کاغذ پر لکھ لیا کرتا ہوں۔ یہی میرا مضمون ہے۔ میرے تمام مضامین "آمد" ہوتے ہیں نہ کہ "آورد"

اس طرح ہر روز کثیر تعداد میں مضامین ذہن میں وارد ہوتے ہیں اور ان کو میں لکھتا رہتا ہوں۔ یہ مضامین اکثر الرسالہ کی ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مضامین جو الرسالہ میں نہیں چھپے، اس وقت بھی میرے پاس اتنے زیادہ ہیں کہ اگر میں مر جاؤں تو ایک آدمی ان مضامین کی بنیاد پر اگلے دس برس تک انشاء اللہ اسی طرح رسالہ کو جاری رکھ سکتا ہے۔

جلگاؤں ریاست مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے۔ ۱۹ویں صدی سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے بعد خاندیش کے علاقہ میں روئی کی کاشت شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ خاندیش روئی کی فصل پیدا کرنے کا ممتاز علاقہ بن گیا۔ اس واقعہ نے جلگاؤں کو اہمیت دیدی۔ یہاں کپڑے کی صنعت وجود میں آئی۔ اولاً ہینڈ لوم اور اس کے بعد پاور لوم نے جلگاؤں کو صنعتی مقام بنا دیا۔

ہر ترقی کے لیے ایک زمین درکار ہوتی ہے۔ جب تک موافق زمین فراہم نہ کی جائے، کسی بھی قسم کی کوئی ترقی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

جلگاؤں میں ہر سال سارو جنک گنیش اتسو کا جلوس نہایت دھوم سے نکلتا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک دو دن کے فرق سے مسلمانوں کا محرم کا جلوس بھی نکلتا ہے۔ ہندوؤں کو محرم کے جلوس کے راستہ (روٹ) پر اعتراض ہوتا ہے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے جلوس کے راستہ (روٹ) پر۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ بڑھتا ہے اور فساد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۹۸۵ میں یہاں کے کلکٹر نے دونوں فرقوں کے لوگوں کی میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں فرقے اپنے اپنے جلوس کا راستہ (روٹ) بدل دیں۔ مسلمان اپنے جلوس کا راستہ بدلنے پر راضی ہو گئے مگر ہندو صاحبان اپنے جلوس کا راستہ بدلنے پر راضی نہیں

ہوئے۔ وقت پر جب جلوس نکلا اور وہ چلتا ہوا اسلام پورہ کے علاقہ کی مسجد کے پاس پہنچا تو وہاں کے مسلمانوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے طیش میں آکر چاہا کہ باہر نکلیں اور جلوس کو روکیں۔ کلکٹر نے دوبارہ کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں میں ٹھہریئے، ہم کو اس مسئلہ سے نمٹنے دیجئے۔ مسلمانوں نے کلکٹر کی بات مان لی اور جلوس کے سامنے نہیں آئے۔ جلوس مسجد کے سامنے رکا ہوا تھا اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً جس کو ہونا پاکستان، اس کو بھیجو قبرستان۔ یا ہندی، ہندو، ہندستان ملا بھاگو پاکستان۔ کلکٹر نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان کیا کہ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر آگے بڑھ جائیے، ورنہ آپ کے اوپر لاٹھی چارج کر دیا جائے گا۔ ایک طرف مجمع اپنی اشتعال انگیز کارروائیوں میں مشغول رہا۔ دوسری طرف کلکٹر نے گھڑی کی سوئی کو دیکھنا شروع کیا۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئی نے بتایا کہ پانچ منٹ پورے ہو گیے، کلکٹر نے فوراً پولیس کو لاٹھی چارج کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد پولیس نے جلوس کو مارنا شروع کیا۔ یہ "پولیس ایکشن" اتنا سخت تھا کہ سارا جلوس بھاگ کھڑا ہوا اور سڑک بالکل خالی ہو گئی۔

ایسے مواقع ملک کے مختلف حصوں میں پیش آتے ہیں۔ ان میں مسلمان یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ صبر اور حکمت کا ثبوت نہیں دے پاتے، وہ خود لڑنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اگر ایسے مواقع پر وہ صبر اور حکمت کا ثبوت دیں تو ہر جگہ وہی کہانی دہرائی جائے جس کا ایک نمونہ جلگاؤں کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتا ہے۔

۹ اپریل کی شام کو جلگاؤں سے اورنگ آباد کے لیے واپسی ہوئی۔ جلگاؤں سے اورنگ آباد کا فاصلہ بذریعہ روڈ ۱۶۰ کلومیٹر ہے۔ جلگاؤں سے اورنگ آباد آتے ہوئے عصر کی نماز راستہ میں ادا کی گئی۔ میرے ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ کھلی جگہ پر نماز ادا کی جائے ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ یہاں گاڑی روک کر ہم سب نے وضو کیا اور کھیت میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

دور تک کھلا میدان تھا جس میں جگہ جگہ درخت ابھرے ہوئے تھے۔ ان کے آگے پہاڑوں کی بلندیاں نظر آتی تھیں۔ اوپر آسمان اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ماحول اپنی اتھاہ عظمتوں کے ساتھ انسانی عجز کی یاد دلا رہا تھا۔ ایسے آفاقی ماحول میں جب

اللہ کے چند بندے "اللہ اکبر" کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑیں تو یہ ایسا منظر ہوتا ہے جیسے کائنات کی خاموشی کو زبان مل جائے، جیسے بے شعور مخلوق اور باشعور مخلوق دونوں اپنے خالق کا اقرار کرنے کے لیے ہم آہنگ ہو گیے ہوں۔

جلگاؤں سے اورنگ آباد جاتے ہوئے راستہ میں اجنتا کے غار آتے ہیں۔ یہاں ٹھہر کر وہ قدیم صنعت دیکھی جس کو قرآن میں الذین جابوا الصخر بالواد کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پہاڑ کی چٹانوں کو تراش کر گھر یا مورت وغیرہ بنانا۔ قدیم زمانہ کی صنعتوں میں سے ایک صنعت یہ بھی تھی۔ اجنتا کے غاروں کے بارے میں خود لکھنے کے بجائے میں مولانا اکبر الدین قاسمی کے الفاظ نقل کرتا ہوں جنھوں نے اجنتا کے مشاہدہ کے بعد مجھے ایک خط میں لکھا تھا:

"جلگاؤں سے واپسی میں اجنٹہ ایک مقام ہے جہاں کے غار بہت مشہور ہیں وہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بدھ مذہب کا کسی زمانے کا بہت بڑا اسنٹر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کل ۲۷ غار ہیں جن میں گوتم بدھ کے کئی ہزار مجسمے مختلف انداز سے تراشے اور اتارے گیے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اجنتا کے اس مقام پر جو آبادی ہے وہ مسلم اکثریتی آبادی ہے جہاں سیاسی اور معاشی طور پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ سرپنچ اور دیگر سیاسی عہدے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی وقت دعوتی کام ہوا تھا جس کی وجہ سے یہاں کی فضا بدھ مذہب کے ماحول میں بھی مسلم فضا بن گئی۔ یہاں ایک تاریخی مسجد ہے۔ جو آصف جاہ اول نے بنائی تھی۔ بڑی شاندار اور لمبی چوڑی مسجد ہے۔ خوبصورت کمانیں کشادہ صحن مسجد کو باوقار بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں عشاء کی نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ نماز کے بعد جب منبر (خطبہ جمعہ کی جگہ) پر نظر پڑی تو وہاں "تذکیر القرآن" رکھی ہوئی تھی۔ امام مسجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ تفسیر یہاں ہر روز بعد نماز فجر سنائی جاتی ہے۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ لوگوں میں تذکیری غذا حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ اللھم زد فزد"

اورنگ آباد میں میرا قیام صوبیدار گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہاں ایک لطیفہ پیش آیا

میں اپنے کمرہ کے باتھ روم میں داخل ہوا تو وہاں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک بڑا سا مینڈک تھا۔ میں نے گیسٹ ہاؤس کے آدمی سے کہا کہ یہاں باتھ روم میں ایک مینڈک ہے۔ اس نے جواب دیا: ہاں، یہاں چوں کہ چاروں طرف باغ ہیں، اس لیے کبھی کبھی باہر سے مینڈک آجایا کرتے ہیں۔

ایک سال پہلے دہلی میں اشوک ہوٹل کے کمرے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ وہاں کیڑے رینگتے ہوئے نظر آئے جس کی وجہ سے ایک امریکی وفد ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا۔ اورنگ آباد کا گیسٹ ہاؤس اور دہلی کا اشوک ہوٹل دونوں حکومت کی ملکیت ہیں۔ آخر سرکاری اداروں ہی میں کیوں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ "پبلک سیکٹر" کو ہندستان میں "پرائیویٹ سکٹر" کے لیے بطور نمونہ قائم کیا گیا تھا۔ مگر اب پرائیویٹ سکٹر ہی پبلک سکٹر کے لیے نمونہ بن رہے ہیں۔

۱۰ اپریل کی صبح کو واپس آتے ہوئے اورنگ آباد ایرپورٹ میں داخل ہوا تو سیکورٹی چک پر ایک شخص پولس کی وردی میں کھڑا ہوا تھا۔ حسب معمول اس نے "چیکنگ" کی۔ اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

آپ کہاں رہتے ہیں

دہلی میں

آپ کا نام کیا ہے

وحید الدین

السلام علیکم (مصافحہ کرتے ہوئے) "میرا نام عثمان علی خان ہے۔ میرے لیے دعا فرمائیے۔"

مذکورہ آدمی کی شخصیت پولیس کی وردی میں چھپی ہوئی تھی۔ مگر جیسے ہی اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے السلام علیکم کہا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پولیس کی وردی کے اندر سے ایک نیا انسان نکل آیا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے۔ پہلے انسان کو آپ ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ مگر دوسرا انسان صرف اس وقت سامنے آتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آکر اس کا پردہ پھاڑ دے۔

میں سونے اور جاگنے کی کیفیت کے درمیان اپنی سیٹ پر تھا کہ اناؤنسر کی آواز کان میں آئی :

اب سے کچھ سمے بعد ہمارا ومان دلی کے ہوائی اڈہ پر اترے گا

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کہنے والا کہہ رہا ہو کہ " اب سے کچھ سمے بعد تمہارا جنازہ قبر میں اترے گا " یہ سوچ کر بدن پر کپکپی طاری ہو گئی ۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گیے۔ دل سے دعا نکلی کہ خدایا، آپ نے خیریت کے ساتھ دہلی پہنچا دیا ہے ، اسی طرح خیریت کے ساتھ آخرت کی بہترین منزل تک پہنچا دیجئے۔ ہر سفر بالآخر موت پر ختم ہونے والا ہے۔ مگر لوگ ہر سفر اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ زندگی کی منزل پر پہنچ رہے ہیں۔

سفر سے واپسی کے بعد جناب ایس اے ناصر صاحب کا خط (۱۳ اپریل ۱۹۸۷) موصول ہوا ہے۔ ان کا وطن جامنیر ہے۔ مگر وہ جلگاؤں کے ایک کالج میں استاد ہیں۔ چنانچہ وہ زیادہ تر جلگاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں : یہاں جلگاؤں میں آپ نے لوگوں کے دلوں میں تشنگی بڑھا دی ، جو اتنا کم وقت یہاں مل سکا۔ آئندہ انشاءاللہ نئے عزم کے ساتھ کام ہوگا۔ جامنیر میں تو آپ لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا کر گیے۔ آپ کی جامنیر کی تقریر کیسٹ سے کاغذ پر نقل کر لی گئی ہے اور اخبار کو برائے اشاعت بھیج دی گئی ہے۔ اگر نظرثانی کر کے اس کو کتابچہ کی شکل میں چھپوا لیں تو بہت بہتر ہوگا۔ یہ تقریر کچھ سمجھ دار لوگوں نے کیسٹ سے سنی تو کہنے لگے کہ ایسا پروگرام تو جلگاؤں میں ہونا چاہیے تھا۔ اور اب وہ دوبارہ خواہش ظاہر کر رہے ہیں کہ یہاں پوری تیاری کے ساتھ پروگرام ہو "

پروفیسر این.جی قاضی (اورنگ آباد) اپنے خط مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں :

" جامنیر میں بعد نماز عصر آپ نے نماز کی حقیقت پر جو روح پرور بیان دیا، واقعی بے حد موثر تھا۔ اس سے نہ صرف آنکھیں نم تھیں بلکہ دل و دماغ بھی رشد و ہدایت کی ضیا سے منور ہو رہے تھے۔ اور میں تو اپنے آپ میں ایک انقلابی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اسی طرح نیشنل انٹگریشن اور اسلام پر جامنیر میں آپ نے جو خطاب عام فرمایا اور جس انداز سے حقیقت کو پیش کیا، اس سے تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً غیر مسلم بے حد متاثر ہوئے "

پریس کانفرنس سے خطاب

سب سے پہلے میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ پریس ملاقات کسی پولیٹکل اشو پر نہیں ہے۔ اور نہ ان باتوں میں سے کسی بات پر ہے جس کو عام زبان میں کرنٹ ٹاپک یا برننگ ٹاپک کہا جاتا ہے۔ ہم اس وقت صرف مارل اشوز پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں پہلے ہی یہ بات بھی کہہ دوں کہ اس ملاقات میں آپ کی طرف سے جو سوالات آئیں وہ اسی اصل ٹاپک پر آئیں۔ اس خاص ٹاپک سے باہر سوال وجواب کے لیے ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔

آپ نے شاید آج (۱۴ فروری ۱۹۸۷) کے انڈین اکسپریس میں انڈیا کے بزرگ جرنلسٹ ایس ملگاؤکر (S. Mulgaokar) کا آرٹیکل دیکھا ہوگا جس کی ہڈنگ یہ ہے:

Can systemic changes provide the entire answer?

اس آرٹیکل کا فرسٹ پارٹ پچھلے سٹرڈے (۷ فروری) کو آیا تھا۔ اس کا دوسرا پارٹ آج کے انڈین اکسپریس میں چھپا ہے۔ اس میں مسٹر ملگاؤکر نے کہا ہے کہ ہماری انڈپنڈنس پر چار ڈیکیڈ گزر چکے ہیں۔ ہم نے کئی اعتبار سے پراگرس بھی کی ہے۔ مگر ہمارے پرابلم ابھی بہت زیادہ ہیں، اور مجموعی طور پر ہمارے مسائل ہماری ترقی سے بڑھے ہوئے ہیں:

Our Problems are many and serious, and on balance, appear to outweight the progress.

مسٹر ملگاؤکر نے ان لوگوں کی بات کو نہیں مانا ہے جو حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے سسٹم میں چینج کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سسٹم تو آخر کار آدمی ہی چلاتے ہیں۔ جب آدمی اچھے نہ ہوں تو سسٹم کیسے اچھا ہوگا:

In the final analysis, a system is only as good as those who operate it.

مسٹر ملگاؤکر کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اس کو بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ مہاتما گاندھی نے ہمارے ملک کو پولیٹکل بیس دیا۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں پاور آیا اور انھوں نے اس ملک کو انڈسٹریل بیس دیا۔ مگر تیسرا کام ابھی ہونا باقی ہے اور وہ ہے اس

ملک کو مارل بیس دینا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تیسری چیز (مورلیٹی) زندگی میں ڈیسائڈنگ فیکٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آخر عمر میں یہ مانا تھا کہ مارل بیس جب تک حاصل نہ ہو، صحیح معنوں میں ملک کو ترقی کی طرف نہیں لے جایا جاسکتا:

> What constitutes a good society? I believe in certain standards. Call them moral standards. They are important in any individual and in any social group. And if they fade away, I think that all the material advancement you may have will lead to nothing worthwhile.

یہ بات اتنی کھلی ہوئی ہے کہ اس کو ایک یا دوسرے لفظوں میں سبھی لوگ کہتے رہے ہیں۔ وہ قریب قریب ایک مانی ہوئی بات ہے۔ اس لیے میں اس کو زیادہ لمبا نہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ مارل بیس کا لفظ میں کسی نیرو سنس میں نہیں بول رہا ہوں۔ بلکہ بہت وسیع معنی میں بول رہا ہوں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارے دیس کا ہر سمجھ دار آدمی اس کی اہمیت کو مانتا ہے۔ ہر سمجھ دار آدمی یہ مانتا ہے کہ ملک اس کے بغیر سچی ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اس کے لیے ابھی تک کوئی بڑی کوشش نہیں کی جاسکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کام میں جلد کوئی رزلٹ سامنے نہیں آتا۔ آپ کوئی پولیٹکل اشو کھڑا کریں تو بہت جلد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ مگر مارل اشو پر جلد کوئی بھیڑ جمع نہیں ہو سکتی۔ اکثر لوگ چونکہ امیجیٹ گین چاہتے ہیں، اس لیے اکثر لوگ اس راہ میں کوشش کے لیے بھی اپنے کو تیار نہیں کر پاتے۔ ہم نے بہر حال اسی کام کو کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ خواہ رزلٹ حاصل کرنے میں دیر لگے ہم اسی راہ پر چلتے رہیں گے۔

ملک کو مارل بیس دینے کے لیے ہمیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ لوگوں کے اندر مارل اویرنس پیدا کریں۔ یہ اس معاملہ میں بہت بیسک بات ہے۔ اس راہ میں ہمیں اپنا سفر اویرنس (Awareness) سے شروع کرنا ہے نہ کہ جلوس اور ایجی ٹیشن جیسی چیزوں سے۔ اس کیمپین میں ہمارا ٹارگٹ انسان ہے نہ کہ کوئی حکومت۔

جیسا کہ میں نے کہا، میں مارل اویرنس کا لفظ کسی محدود معنی میں یا نیرو سنس میں نہیں بول رہا ہوں۔ بلکہ وسیع معنی میں بول رہا ہوں۔ اس سے میری مراد خاص طور پر اس چیز سے ہے جس کو دوسرے لفظوں میں کانسٹرکٹیو تھنکنگ کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مسائل کو لڑے بھڑے بغیر حل کرنا۔

دوسروں سے ٹکراؤ کو اوائڈ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا، ممکن چیز (Possible) سے اپنا کام شروع کرنا نہ کہ اس چیز سے جو ناممکن (Impossible) ہے۔ اس کے سوا جو طریقے ہیں وہ سب کھونے کے طریقے ہیں، وہ پانے کے طریقے نہیں ہیں۔

جاگ یا اویرنس پیدا کرنے کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ تعمیری انداز میں ہو۔ یعنی اس کا رخ اپنی طرف ہو نہ کہ دوسروں کی طرف۔ دوسروں سے مانگ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھا جائے۔ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ابھارا جائے۔ لوگوں کے اندر جذباتی اندازِ فکر (Emotional approach) ختم کیا جائے اور ان کے اندر عقلی اندازِ فکر (Rational approach) پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ذہن بنایا جائے کہ لوگ معاملہ کو دوسرے کے اوپر نہ ڈالیں بلکہ اس کی ذمہ داری خود قبول کریں۔ جہاں معاملہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا ہو وہاں ذمہ داری خود قبول کرنے سے مسئلہ حل ہوتا ہے، دوسروں کے اوپر ڈالنے سے کبھی مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

اویرنس پیدا کرنے کا یہ کام مجاریٹی کیمونٹی اور مائناریٹی کیمونٹی دونوں کے درمیان کرنا ہے۔ دونوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ دوسروں کو بلیم دینے کا طریقہ چھوڑیں اور اپنے آپ میں جھانک کر دیکھنے کا مزاج پیدا کریں۔ وہ ماضی کی باتوں کو بھلائیں اور مستقبل کے لحاظ سے اپنی منصوبہ بندی کریں۔ تاہم اس وقت میں اس کوشش کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میں اور میرے ساتھی مائناریٹی کیمونٹی کے اندر کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کو ہم پچھلے دس سال سے اسی ڈھنگ پر ایجوکیٹ کر رہے ہیں، اور لٹریچر اور ملاقات اور کیسٹ اور تقریروں کے ذریعہ ان کے اندر تعمیری شعور (Mind building) کی مہم چلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت لمبی بات ہے۔ ہمارے اردو اور انگلش میگزین کو دیکھ کر اس کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہاں میں بات کو واضح کرنے کے لیے صرف دو بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ (باقی)

مَنْ اَنصَارِیْ اِلَی اللّٰہ

الرسالہ (انگریزی) کے دو شمارے ایک پروفیسر صاحب کی نظر سے گزرے۔ اس کے بعد انھوں نے ہمارے نام ایک خط لکھا ہے۔ یہ خط یہاں انھیں کے لفظوں میں نقل کیا جاتا ہے:

I am thankful to you for sending me the October 87 number of *Al-Risala*. I had duly received an earlier number as well. It is informative and full of thought-provoking materials. It seemingly provides intellectual food for thought. India and China had been rich in intellectual traditions all through history. Muslim intellectuals in the past with their rusty knowledge and methodology failed to make much headway. I wish all success to the contemporary ones including those associated with your esteemed journal, the *Al-Risala*. I wish to subscribe to it. But my pocket does not allow at the moment. I shall see, if I do in future.

Prof. Sanghasena Singh, Head, Department of Buddhist Studies, Faculty of Social Sciences, Delhi University, Delhi 110 007

اس طرح کے خطوط ہم کو برابر ملتے رہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزی الرسالہ (جاری شدہ فروری ۱۹۸۴) پورے عالم اسلام کا واحد پرچہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکل رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے قومی جھگڑوں سے مکمل طور پر الگ ہو کر دین خدا کی بے آمیز دعوت کو عالمی سطح پر سمجھی جانے والی زبان میں پیش کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلمان یا تو ملّی تحفظ کے کاموں میں مشغول تھے یا قومی جھگڑوں کے میدان میں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ پورے عالم اسلام میں کوئی ایک جریدہ ایسا نہ تھا جو خدا کے دین کی ایجابی دعوت کو بین اقوامی زبان میں پیش کرے۔ ایسی حالت میں الرسالہ (انگریزی) کا نکلنا گویا پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ کی ادائیگی کا انتظام ہے۔ اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمام دنیا میں غیر مسلم قوموں کے تعلیم یافتہ افراد تک پہونچائے۔

ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کم از کم ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم بھائی کے نام الرسالہ انگریزی کو اپنی طرف سے جاری کرائے۔ یہ دعوتِ حق کی مہم میں اپنے آپ کو شامل کرنا ہے، اور دعوتِ حق کی مہم میں شامل ہونے سے زیادہ بڑی کوئی سعادت انسان کے لیے نہیں۔

۱۔ مائناریٹیز کمیشن کی طرف سے ۲۲ اگست ۱۹۸۷ کو نئی دہلی میں ایک سیمینار تھا۔ اس سیمینار کا عنوان تھا :

Human Rights and Value Education.

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس سیمینار میں شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایک تقریر کی۔ عام طور پر لوگوں نے اس کو پسند کیا۔

۲۔ دہلی (بھوجلہ پہاڑی) میں ۳ اگست ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں علاقہ کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا : ملی تعمیر کے لیے علم کی اہمیت۔ تقریر میں یہ بتایا گیا کہ علم یا تعلیم کا اصل مقصد سروس حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ مختلف تاریخی مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا کہ علمی شعور کس طرح قوموں کی ترقی اور کامیابی میں مددگار ہوتا ہے۔

۳۔ ایک صاحب جو دوحہ (قطر) میں بحیثیت استاد کام کر رہے ہیں اپنے خط (۱۳ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں : یہاں لائبریری میں "مذہب اور جدید چیلنج" نظر آئی۔ اَلْاِسْلَامُ یَتَحَدّٰی تمام مکتبات میں موجود ہے۔ پچھلے جمعرات کو حسنِ اتفاق سے ریڈیو پر آپ کی تقریر "حج کی اجتماعی اہمیت" سامعہ نواز ہوئی۔ پوری تقریر میں نے ٹیپ کر لی۔ اور یہاں اپنے طلبہ کو کلاس میں سنائی۔ عرب طلبہ نے کہا : یہ نام ہمارے یہاں معروف ہے۔ اب میں الاسلام یتحدیٰ خرید کر ان میں تقسیم کرنے والا ہوں (ڈاکٹر شفیق ندوی)

۴۔ انڈین ریلوے اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک میگزین نکلتا ہے جس کا نام ہے سنکتین۔ اس میں بیک وقت انگریزی اور ہندی مضامین ہوتے ہیں۔ اس میگزین میں الرسالہ کے مضامین نمایاں طور پر انگریزی اور ہندی زبانوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۸۷ میں صفحہ ۳ پر اور اپریل ۱۹۸۷ میں صفحہ ۴ پر۔ یہ میگزین گورکھپور سے شائع ہوتا ہے۔

۵۔ ایک صاحب جو نسلاً انگریز ہیں۔ انھوں نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر عربی

اور اردو اور فارسی اور پشتو زبانیں سیکھیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے "اسلامی تعلیمات" کے ایک باب (آدمی کا امتحان) کے بارے میں اپنا تاثر حسب ذیل الفاظ میں روانہ کیا ہے:

I think I have a reasonable grasp of the gist of the whole passage now. Man has been given power on earth, so there are some who will work corruption, but also some who will use their power to good ends; for this has the world been created. So man is being tested, by being given power, and his most crucial test comes when he has to acknowledge the right of some other person. What good sense this explanation makes; everything fits in. Strange, no one else thought of it up till now. They make the whole episode a focus of human pride, instead of human responsibility, proud of being made Khalifah, proud of being bowed down to by the angels, proud of being given knowledge of the "names". Jan Mohammad Butt, London.

ایک صاحب اپنے خط ۱۸ جولائی ۱۹۸۷ میں غازی پور سے لکھتے ہیں: الرسالہ پابندی سے برابر موصول ہو رہا ہے۔ میں الرسالہ پڑھنے کے بعد متعدد لوگوں کو دے دیا کرتا ہوں جو کہ اس کا مطالعہ بڑے ذوق شوق کے ساتھ کرتے ہیں اور بحمد اللہ اس کے مطالعہ کے بعد میں نے لوگوں میں بڑی تبدیلیاں محسوس کیں۔ سوچنے سمجھنے اور بحث کرنے کا ان کا انداز یکسر بدل گیا۔ یہ ایک خاموش انقلاب ہے جو ایک خوب صورت انداز میں لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خوش گوار تبدیلی بے حد مفید اور عظیم ثابت ہوگی (ڈاکٹر ایس ایچ صدیقی)

ایک صاحب اپنے خط (۲۹ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کے ذریعہ ہم ایک عظیم فتنہ سے بچے۔ میرا دل، جس میں پہلے تعصب کی بھٹیاں جلتی رہتی تھیں، الحمد للہ اس میں اب اللہ کی توفیق سے دوسروں کے لیے خیر خواہی ہے۔ اللہ میری کوتاہیوں سے درگذر فرمائے (رشاد حسین، سرینگر)

اسلامی مرکز کے فکر کی مزید اشاعت کے لیے یہ مہم شروع کی گئی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے انگریزی اخبارات میں "خطوط" شائع کرائے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے متعدد خطوط قومی روزناموں میں چھپ چکے ہیں اور خدا کے فضل سے ان کا اچھا اثر مترتب ہو رہا ہے۔

مسٹر جے ایف ربیرو (ڈائرکٹر جنرل آف پولس ، پنجاب) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک آرٹیکل (مطبوعہ ٹیلی گراف) پڑھا جس کا عنوان تھا :

Only goodness can cure the evil of communalism

مسٹر ربیرو نے اس کو (Very interesting article) قرار دیتے ہوئے اپنے خط مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۸۷ میں لکھا ہے :

It is a difficult solution, but constant efforts should be made by the leaders to solve problems in the suggested manners

اسلامی مرکز کے فکر کو خدا کے فضل سے یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ بڑی تعداد میں لوگ اس کو دہرانے لگے ہیں۔ تھوڑے لوگ حوالہ کے ساتھ اور بیشتر لوگ حوالہ کے بغیر۔ دوسری قسم میں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے جو الفاظ اور ترتیب کے معمولی فرق کے ساتھ اس کو اپنی تحریروں کے درمیان شامل کر لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو سیدھے سیدھے ہماری تحریر کو اپنے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ اسلامی مرکز کے فکر کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

صدر اسلامی مرکز نے ۱۳ اگست ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا : سچائی کیا ہے اور ہم کس طرح اسے پا سکتے ہیں۔ اس اجتماع میں سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اکثریت غیر مسلم صاحبان کی تھی۔

ایک صاحب نے الرسالہ کے منتخب مضامین کو گجراتی زبان میں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب چھپ گئی ہے اور حسب ذیل پتے سے مل سکتی ہے :

Ghulam Rasool Kamili, Kalupur, Panch Patti, Mullaharun's Pole, Ahmedabad 360 001

اسلامی زندگی کو سمجھنے کے لیے مولانا محمد یوسف صاحب ؒ کی کتاب حیاۃ الصحابہ نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔ اس کا عربی اڈیشن اعراب کے ساتھ دہلی کے ایک ادارہ نے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد عبد اللہ طارق صاحب کی تحقیق و تعلیق کے اضافہ نے اس کی افادیت مزید بڑھا دی ہے۔ تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں :

ادارۂ اشاعت دینیات ، بستی حضرت نظام الدین ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address: ☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76
November 1987 No 132